کرنیں
شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن

۱۹۴۲

# ترتیب

# شکست

جھیل ڈل کے شفاف و ساکن پانی پر نئے نئے نکلے ہوئے سُورج کی کرنیں تیر رہی تھیں۔ کہیں کہیں اِکا دُکا کنول کا پھُول نظر آ جاتا تھا۔ آبی چڑیاں ہوا میں زقندیں بھر رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے سفیدے کے درخت بالکل خاموش کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جھاڑیاں اور سُرخ سُرخ پہاڑ جن میں سبزے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب کسی کے منتظر ہیں۔

ہم صُبح کی سیر سے واپس آ رہے تھے۔ میں شکارے سے جھکی ہُوئی اپنا ہاتھ لٹکائے پانی سے کھیل رہی تھی۔ فضا میں ایک ناگوار سا جمود تھا۔ بالکل میرے دل کی طرح۔ ہمیں کشمیر آئے بمشکل ایک مہینہ گزرا ہو گا، مگر میں اس سکون سے تنگ آ گئی تھی۔ ہر روز وہی باسی پروگرام ۔۔۔ صُبح سیر، شام کو پھر سیر، دوپہر ہاؤس بوٹ میں گزارو! رات کو سو جاؤ، کیا ہوا جو پانچویں چھٹے دن کار میں پہلگام یا گلمرگ چکر لگا آئے۔ ہمارے ساتھ کے ہاؤس بوٹ میں والدہ صاحب

کے کسی دوست کا کُنبہ تھا جس میں کوئی حامد صاحب میرے منگیتر بننے کے اُمّیدوار تھے اور غالباً اس اُمید پر آئے تھے مگر نہ معلوم کیوں مجھے وُہ ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے تھے۔

میں نے ساکن درختوں کو دیکھا۔۔۔ صرف ملّاحوں کے چپوؤں کی آواز تھی جو اس خاموشی کو توڑ رہی تھی، ورنہ ہر چیز میں سکون تھا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے دل کے ساتھ زمین کی گردش بھی ساکن ہو گئی ہو۔

مجھے کسی ایسی چیز۔۔۔ کسی ایسی ہستی کا انتظار تھا جو اس جمود کو توڑ کر زندگی میں ہلچل پیدا کر دے، جس کے وجود سے اس ٹھہرے ہوئے دل میں نئی نئی امنگیں پیدا ہوں۔ اتنے دنوں سے میں اسی نامعلوم ہستی کی منتظر تھی۔

"افّوہ! ساڑھے نو بج گئے ہیں۔ جلدی کرو۔" ابّا بولے۔

ملّاحوں نے شکارے کی رفتار اور تیز کر دی۔

"ارے یہ کون؟" ابّا پانی میں کھڑے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارے کرتے ہوئے بولے۔

"کہاں؟" امّی چونک پڑیں۔

"وُہ رہا باتھ کی چھت پر! کہیں اشفاق تو نہیں؟"

"اشفاق؟ ہاں لگتا تو کچھ کچھ ویسا ہی ہے۔ مگر اشفاق یہاں کہاں؟"

"ہاں شاید کوئی اور ہو، مگر مجھے تو یہ اشفاق ہی لگتا ہے۔" ابّا بولے۔

میں نے ذرا غور سے دیکھا۔ ایک لمبا سا لڑکا باتھ کی چھت پر کھڑا دونوں بازو تان کر نہایت خوبصورتی سے چھلانگ لگا رہا تھا۔ دوسرے باتھ پر کچھ ٹامی نہا رہے تھے۔ میں بے چین سی ہو گئی۔ شاید اشفاق ہی ہو۔ مگر مجھے تو بھول چُکا ہو گا۔

"ان ہی میں سے ہو گا کوئی۔" امّی ٹامیوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے بولیں۔

وُہ پانی سے نکل کر باتھ پر آ گیا۔

"تو آپ کا مطلب ہے یہ ٹامی ہے؟ لاحول ولا قوۃ، بیچارہ اچھا بھلا اشفاق ہی تو ہے۔۔۔۔ ارے ٹھہرو!"

شکارہ آہستہ ہوا۔ پھر ٹھہر گیا۔

"اسے بلاؤں؟"

"اور جو یہ کوئی اور ہوا تو؟" امّی بولیں۔

”لانا بھئی ذرا دُور بین۔۔۔!“ میں نے دُور بین دے دی۔

”ہو بہو بالکل وہی ہے۔ ارے اشفاق!“ ابّا نے آواز دی۔

اُدھر کیا تو وُہ چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہا تھا اور کیا ایک دم رُک گیا۔

”بھیّا اشفاق!“ نعیم ایک دم چلّایا۔

وُہ نہایت تیزی سے تیرتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔

یہ اشفاق ہمارا کیا لگتا ہے؟ میں سوچنے لگی۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ اس کے اور ہمارے کُنبوں میں ربط ضبط ہے۔ بس! ابّا اور امّی سے تو یہ ملتا رہا ہو گا۔ مگر دو سال سے لاہور میں رہتے ہوئے بھی اس سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

وُہ بالکل نزدیک آ گیا۔

”ارے تم یہاں کہاں؟“ ابّا مسرّت سے مغلوب ہو کر بولے۔

اُس نے تیرتے ہوئے ہاتھ بلند کر کے سلام کیا۔

”جی بس! یوُنہی تیرنے آ گیا تھا!“

”کشمیر کب آئے؟ کوئی ساتھ بھی ہے؟“

"ابھی کالج میں چھٹیاں ہُوئی تھیں۔ بس اکیلا ہی چلا آیا۔"

"تو دوڑ کر کپڑے لے آؤ۔ آؤ ہمارے ساتھ۔" امّی بولیں۔

"جی! اس حُلیے میں۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو ذرا ٹھہر کر آ جاؤں گا!"

"میں ابھی وہاں پہنچ کر چھوٹی کشتی لے آتا ہوں۔ اس میں واپس چلیں گے۔" نعیم بولا۔

۔۔۔ بات طے ہو گئی۔ اُدھر وُہ تیرتا ہوا واپس چلا گیا۔ ادھر ہمارا شکارا چل پڑا۔ ذرا سی دیر کے بعد وُہ ہمارے ہاؤس بوٹ میں پہنچ گیا۔ اب جو امّی اور ابّا نے سوالوں کی بوچھاڑ کی ہے تو بیچارہ ایک مرتبہ تو گھبرا ہی گیا۔ غالباً بہت دنوں سے انہیں بھی یہاں کوئی آشنا چہرہ نظر نہ آیا تھا۔۔۔ اُس روز اُسے شام تک وہیں بٹھائے رکھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ وُہ مجھ سے بھی باتیں کرے چنانچہ میں کئی مرتبہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں سے گزری۔ میں چاہتی تھی کہ پہلے وُہ گفتگو شروع کرے۔

"یہ کون ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"ارے نجمہ تو ہے! جانتے نہیں؟"

"خوب! تو یہ نجمہ ہیں۔ تو یہاں آکر چُپ چاپ بیٹھ کیوں نہیں جاتیں۔"

امّی نے مجھے بُلا لیا۔ میں کھسیانی سی ہو گئی۔ اس نے فقط ایک مرتبہ سرسری طور پر مجھے دیکھا اور چپ ہو گیا۔ حالانکہ میرا دل چاہتا تھا کہ وُہ مجھے امتحان میں کامیاب ہونے کی مبارکباد دے۔

امّی نے خود ہی ذکر کیا۔ "نجمہ امتحان میں پاس ہو گئی ہے۔ سیکنڈ ڈویژن آئی ہے، اپنے کالج میں پانچواں نمبر آیا ہے۔"

"اچھا! مگر میں نے سُنا ہے کہ اس سال یونیورسٹی نے تقریباً ساری لڑکیوں کو پاس کر دیا ہے اور پھر سیکنڈ ڈویژن۔۔۔ کوئی خاص کارنامہ تو ہے نہیں۔ بس محض پاس ہونے کے برابر ہے۔"

میں جل ہی تو گئی۔۔!

شام کو وُہ واپس گیا۔ کسی دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ابّا نے بہتیری کوشش کی کہ اُسے یہیں ٹھہرا لیں۔ مگر وُہ نہ مانا۔ البتہ یہ مان گیا کہ دن میں کم از کم دو مرتبہ حاضری دیا کرے گا۔ اس طرح اس کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ وُہ مجھ سے بہت کم باتیں کرتا اور باتیں بھی بالکل اُکھڑی اُکھڑی سی۔ ابّا اور امّی کو اپنی باتوں سے اتنا ہنساتا کہ وُہ بے حال ہو جاتے۔ بچّوں میں مل کر بالکل بچّہ بن جاتا،

مگر ان سب باتوں کے باوجود کیا مجال، جو اس کا غرور ایک لمحے کے لیے بھی کم ہوا ہو!

چند روز بعد کا ذکر ہے۔ رات کے کوئی نو بجے ہوں گے۔ بڑے زور کا مینہ برس رہا تھا۔ میں کُرسی بچھائے بچّوں کے بستروں کے درمیان بیٹھی انہیں پریوں کی کہانی سُنا رہی تھی۔ نیند تو مجھے بھی آ رہی تھی مگر میرا خیال تھا کہ اگر بچّے میرے سامنے ہی نہ سو گئے تو کسی کو بھی سونے نہیں دیں گے۔ بجلی بڑے زور سے کڑکی اور سب کے سب رضائیوں میں دُبک گئے۔ اشفاق ابھی واپس نہیں گیا تھا۔ دوسرے کمرے میں امّی سے باتیں کر رہا تھا۔

میں ایک شہزادے اور پری کی پہلی ملاقات کا حال بچّوں کو سُنا رہی تھی کہ یکایک وُہ کمرے میں داخل ہوا۔

”اخّاہ! داستانِ امیر حمزہ ہو رہی ہے، ہم بھی تو سُنیں۔“

میں چُپ ہو گئی۔

”آپ رُک کیوں گئیں؟ اچھا لو بھئی بچّو! ایک کہانی میں سناتا ہوں۔“

میں بدستور خاموش تھی۔

"اچھاتوسناؤں کہانی؟"

"ہاں ہاں سنائیے!" بچّے یک زبان ہو کر بولے۔

"ایک تھالڑکا، وُہ پڑھتا تھاڈاکٹری۔۔۔جب چھٹیاں ہوئیں تووُہ گھر آیااور اپنے ساتھ مُردے کی ہڈیاں بھی لایا۔"

"مردے کی ہڈیاں۔ قبر میں سے نکال کرلایاہو گا؟" ننّھا نعیم ڈر کر بولا۔

"نہیں بھئی، اُس نے خریدی تھیں۔"

"عزرائیل سے خریدی ہوں گی۔" عفّت نے رضائی سے مُنہ باہر نکال کر کہا۔

"نہ نہ بھئی، یہ بات ٹھیک نہیں، تُم بولو مت! ورنہ ہم کہانی نہیں سُنائیں گے!

ہاں توان ہڈیوں میں ایک سفید سی کھوپڑی تھی۔ ایک اندھیری رات کو۔ جبکہ بڑے زوروں کی بارش ہورہی ہو تھی اور چاروں طرف اندھیراہی اندھیرا تھا۔ بالکل جیسے آج کی رات ہے۔ ایسی رات تھی کہ گھر میں ایک عجیب سی آہٹ سُنائی دی۔ کسی نے چپکے سے ٹارچ روشن کی اور دیکھا۔۔۔ کہ وہی کھوپڑی فرش پر چل رہی تھی۔۔۔۔"

"چل رہی تھی۔۔۔سچ مُچ" ننھے نے رضائی میں مُنہ دبکالیا۔

”جی ہاں چل رہی تھی۔ خوب چل رہی تھی۔ کبھی اُدھر جاتی تھی اور کبھی اِدھر۔ ایک نے دوسرے کو جگایا، دوسرے نے تیسرے کو، بس گھڑی بھر میں گھر کا گھر جاگ اُٹھا۔ کوئی بندوق تلاش کر رہا ہے۔ کوئی آیۃ الکرسی پڑھ رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے۔ پولیس کو اطلاع دے دو۔ مگر ڈر کے مارے سب کے سب کانپ رہے تھے۔۔ ذرا خود ہی سوچو۔ اگر یہاں کوئی کھوپڑی چلتی ہُوئی آ جائے تو تم نہ ڈرو گے ؟“

”ہاں ہاں ڈریں گے “سب بچے چیخ کر بولے۔ ”پھر کیا ہُوا۔۔ ؟“

اتنے میں وُہ لڑکا بھی جاگ اُٹھا اور کُنبے کی اس گھبراہٹ پر خوب ہنسا۔ اُس نے نہایت اطمینان سے اپنا جُوتا اُٹھایا اور اسے کھوپڑی پر دے مارا!

”جُوتا مارا؟“ عفّت سہم کر بولی۔

”ہاں فلیکس کا خوبصورت سا جُوتا جو اُس نے اسی سال نمائش سے خریدا تھا جو تاک کر مارا تو!“

”تو پھر کیا ہوا؟“ نعیمہ چیخ کر بولی۔

"جُوتا لگتے ہی کھوپڑی اُلٹی اور اس میں سے ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا؟" سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ صرف نعیم ہی تھا جو بناوٹی ہنسی ہنسنے لگا۔ ورنہ سب سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

"مگر چوہا کِس طرح اندر آ گیا؟" نعیم بولا۔

"دراصل یہ کھوپڑی اوندھی رکھی تھی۔ اتّفاق سے اُوپر سے ایک چوہا اس میں گرا اور کھوپڑی کے سوراخ میں چلا گیا۔ کھوپڑی سیدھی ہو گئی۔ گھبرا کر چوہے نے اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی کھوپڑی بھی چلنے لگی۔"

کیا تو پریوں کے لطیف قصّے ہو رہے تھے اور کیا یہ خطرناک سا واقعہ سُنا۔ کمرے میں ایک عجیب ڈراؤنی سی خاموشی طاری ہو گئی۔

"اچھا اب ایک اور چھوٹی سی کہانی سُناتا ہوں۔ جس جگہ لڑکے ڈاکٹری پڑھتے ہیں۔ وہاں کئی کمرے ہوتے ہیں جہاں مُردے ہی مُردے پڑے ہوتے ہیں۔ انہیں وُہ لڑکے خوب چیرتے پھاڑتے ہیں۔"

"چیرتے ہیں۔۔۔! اوئی۔" نعیمہ کی رضائی سے آواز آئی۔

"ہاں انہیں چیرتے ہیں اور بوٹی بوٹی کر ڈالتے ہیں۔ ایک دن ایک لڑکا علیٰحدہ ایک کمرے میں مُردہ چیر رہا تھا کہ یکایک مُردے نے جو تھپڑ دیا ہے لڑکے کے مُنہ پر۔۔۔بس مزا ہی آگیا۔ لڑکے کا سر دیوار سے لگا جا کر!"

"آپا ذرا میرے پاس آجاؤ!" ننھی ڈر کر بولی۔ میں اس کے پاس جا بیٹھی۔

"تو کیا تھپڑ مار دیا مُردے نے؟" فہیم نے دبی آواز سے پوچھا۔

"ہاں سچ مچ! وُہ زنّاٹے دار تھپڑ دیا کہ لڑکے کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وجہ دراصل یوں تھی کہ مُردے کے دونوں ہاتھ اکڑے ہوئے تھے اور انہیں زور لگا کر سیدھا کیا گیا تھا اور نیچے ایک تختہ رکھ کر ہاتھوں کو میخوں کے ذریعے تختے میں گاڑ دیا گیا تھا۔ وُہ لڑکا مُردے کی بغل میں کچھ چیر اپھاڑی کر رہا تھا۔ جب وُہ آگے جھکتا تھا تو تختہ ذرا سا ہل جاتا۔ اور اس طرح ایک طرف کی میخ ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ اس بیوقوف کو پتہ نہیں تھا۔ آخر ایک مرتبہ جو وُہ نشتر لے کر بغل پر جھکا تو تختہ پھر ہلا اور میخ تختے سے نکل گئی۔ مُردے کا ہاتھ بڑے زور سے گھوما اور پڑا لڑکے کے مُنہ پر۔۔۔!"

"تو کیا وُہ لڑکا مر گیا؟" نعیمہ نے چپکے سے پُوچھا۔

"نہیں، اس میں مرنے کی کیا بات تھی، البتّہ اس کا خوب مذاق اُڑا۔ لڑکے اُسے چھیڑا کرتے کہ یہ وہی صاحب ہیں جو مُردے سے پِٹ گئے تھے۔"

"اشفاق بھیّا!" نعیم کی آواز آئی۔ "آیئے بارش بند ہو گئی ہے۔" وُہ بچّوں کو پیار کر کے چلا گیا۔

اب میرے لیے آفت آ گئی۔ سب کے سب بچّے سہمے ہوئے میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی کھوپڑی کے متعلق پوچھ رہا ہے اور کوئی مُردے کے تھپڑ کے متعلق! ساتھ ہی ڈر بھی رہے ہیں اور کانپ بھی رہے ہیں۔ ادھر میں بہتیرا سمجھاتی ہوں کہ یہ جھُوٹ بول رہے تھے۔۔۔ مگر کیا مجال جو اُنہیں ذرا بھی یقین آتا ہو۔ ننھی تو میری گود سے اُترتی ہی نہ تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رات کے بارہ بجے تک مجھے جاگنا پڑا۔ جب جا کر کہیں بچّے سوئے اور تب بھی رات بھر چونک چونک پڑتے تھے۔ مجھے بھی خواب میں عجیب فضولیات سی دکھائی دیں۔ کہیں کھوپڑیاں رینگ رہی ہیں اور کہیں مُردوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔

اگلے روز شاہی چشمے کا پروگرام تھا۔ صُبح کی بارش کی وجہ سے نہ جا سکے۔ کوئی چار بجے موسم ایسا ہو گیا کہ ہم باہر کہیں جا سکتے تھے۔ ہمارے پڑوس کا کُنبہ بھی ساتھ ہی آ گیا۔ اتنے آدمیوں کے لیے ایک کار ناکافی تھی۔ چنانچہ طے ہوا کہ آدھے

ایک دفعہ جائیں اور آدھے دوسری دفعہ۔ بزرگوں نے بعد میں جانا پسند کیا۔ ہم لوگ کار میں لد گئے۔ نعیم چلانے بیٹھ گیا۔ حامد اس کے ساتھ ۔ میں پیچھے بیٹھ گئی۔ اشفاق اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ شاید کار بھر گئی تھی۔ اس لیے میں نے جلدی سے ننھی کو اُٹھا کر گود میں بٹھالیا اور اس کے لیے اپنے برابر جگہ خالی کر دی۔ اس نے دروازہ کھولا اور دیکھ کر کچھ مُسکرایا۔ میں اور بھی سُکڑ کر ایک طرف ہو گئی۔ اس نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”بھئی نعیم، چلو تم، یہاں پہلے ہی بھیڑ ہے۔ میں پھر آ جاؤں۔“

میں نے دھم سے ننھی کو اپنے برابر پٹخا۔ نہیں جاتا ہے تو نہ جائے۔ بدتمیز کہیں کا۔ جیسے میں چاہتی ہی تو تھی کہ یہ میرے برابر بیٹھ جائے۔ مجھے اس کی پرواہ ہی کیا ہے۔ اگر بیٹھ بھی جاتا تو کیا شان میں فرق آ جاتا؟

شاہی چشمے پر خوب سیر کی۔ ساتھ ہی ایک بڑا سا باغ تھا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی تھے۔ سامنے پہاڑ پر پری محل نظر آ رہا تھا۔ کوئی کہتا تھا یہاں پریاں اُترتی ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہاں حضرت سلیمان کا تخت اُترا تھا۔ مگر جو کچھ بھی تھا عجیب ٹُوٹا پھوٹا سا تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ چلو وہاں چلیں۔ اچھی خاصی چڑھائی تھی اور ویسے شام کا جھٹ پٹا سا وقت تھا۔ حامد صاحب نے تو **فوراً** ہی

استعفیٰ پیش کر دیا اور ایک بڑے سے پتھر پر سستانے بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وُہ چڑھائی کا نام سُنتے ہی یکلخت تھک گئے ہیں۔ میں نے محض اسی ضد میں آ کر چڑھنے کی ٹھان لی۔ امّی نے بہتیرا منع کیا کہ تھک جاؤ گی مگر وہاں کون سُنتا تھا۔ ابّا نے کہا کہ جو بھی پہلے وہاں پہنچے گا، اسے وُہ ایک ڈبہ ٹافی کا دیں گئے۔ جسے وُہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ باقاعدہ مقابلہ شروع ہُوا۔ ذرا سی دُور ہی چڑھ کر تین چار تو بیٹھ گئے۔ نعیم وغیرہ بھی رہ گئے۔ اب میں اور اشفاق رہ گئے تھے۔ وُہ بڑے اطمینان سے سیٹی بجاتا ہوا چڑھ رہا تھا۔ اِدھر میرا بُری طرح سے سانس چڑھا ہوا تھا اور ہانپ رہی تھی۔ بھلا میرا اس کا مقابلہ ہی کیا تھا۔ وُہ جان بوجھ کر تیز چل رہا تھا۔ کئی دفعہ میرے جی میں آیا کہ اُسے آہستہ چلنے کے لیے کہوں۔ مگر اس میں صاف میری ہار تھی۔

پیچھے مُڑ کر جو دیکھتی ہوں تو راستے کے ہیر پھیر میں وُہ لوگ سب اوجھل ہو چکے تھے۔ پری محل ابھی خاصی دُور تھا۔ قریب ہی تھا کہ تھکاوٹ سے میں گر پڑوں، اُس نے اپنا بازو سہارے کے لیے میری طرف بڑھایا۔ میں نے پہلے تو انکار کر دیا ۔ مگر اور کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ مجبوراً اس کا بازو تھام لیا۔ اس نے ایک شوخ رنگ کی جرسی پہن رکھی تھی۔ میرے ہاتھ میں آگ سی لگی ہُوئی تھی۔ اس کے مضبوط بازو کا سہارا لیے ہوئے میں اپنے آپ کو کس قدر محفوظ محسوس کر رہی

تھی۔۔۔مجھے چڑھائی کا پتہ ہی نہیں چلا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اب اچھی طرح یاد نہیں۔شاید میرا سر اس کے کندھے سے چھُو گیا ہو۔ میرا جی چاہتا تھا کہ راستہ ختم ہی نہ ہو،۔۔۔لیکن بہت جلد ہم پری محل پہنچ گئے ۔۔۔اور سبزے پر ستانے بیٹھ گئے۔ تیسری یا چوتھی کا چاند سامنے چمک رہا تھا۔ فضا میں خُنکی تھی۔ ہمارے قدموں میں جھیل کا شفاف پانی جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے میرے بالوں کی لٹیں لہرا رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا وُہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرے۔

"اب واپس چلیں!" وُہ بولا۔

"ٹھہریئے!ابھی سانس تو ٹھیک ہو جائے۔"

"اچھا تو ذرا جلدی سے سانس ٹھیک کر لیجئے،ورنہ بھیگ جائیں گے۔سامنے بارش کے آثار ہیں۔" وُہ اپنے جوتے کے تسمے کسنے لگا۔کس قدر بد مذاقی جتا رہا تھا وُہ۔۔۔

مَیں تمہید باندھنے لگی۔

"یہ پہاڑ کتنے شاندار معلوم ہو رہے ہیں اور اُن کی چوٹیاں ۔۔۔۔آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔"

"کیسے بیہودہ لُنج منج سے پہاڑ ہیں۔ کوئی ایسے اونچے بھی نہیں ہیں۔ نہ کوئی درخت ہیں نہ پھُول، محض گھاس ہی گھاس ہے، وُہ بھی کہیں کہیں!"

"اور یہ جھیل! اس پر پھیکی پھیکی چاندنی کیسی کھلی ہُوئی ہے!"

"ابھی چاند تو پرسوں ہی نکلا ہوگا اور آج چاندنی بھی کھل گئی۔ باقی رہی یہ جھیل، اُوپر سے تو خیر جیسی ہے سو ہے سو ہے ہی۔ مگر اس کے اندر اس قدر جھاڑ پھونس اُگا ہوا ہے کہ خدا کی پناہ۔ انسان غوطہ تو مار سکتا ہی نہیں۔ ایک روز میرا تو پاؤں اُلجھ چلا تھا۔" میں کھسیانی سی ہو گئی۔

"اور وُہ پیارے پیارے سفیدے کے درخت۔۔۔ کس انداز سے کھڑے ہیں، جیسے۔۔۔۔؟"

"ہاں جیسے کیا؟ جیسے کالے کالے بھُوت کھڑے ہوں۔ لا حول ولا قوۃ اور پھر سفیدے کا درخت بھی کوئی درخت ہے۔ سرو کے درخت تو پھر بھی کچھ ہوئے۔ مجھے تو آم کا درخت کہیں اچھا لگتا ہے اور کچھ نہیں کم از کم آم تو لگتے ہیں۔ اور جامن کا درخت بھی اچھا خاصا ہوتا ہے۔"

میں جھنجھلا اُٹھی۔۔۔ گھر بھر میں کسی کی کیا مجال جو میری ہاں میں ہاں نہ ملائے اور یہ تھا کہ ہر بات کاٹ رہا تھا۔

"اچھا چلئے اسی وقت۔" میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا دیا اور شرارت آمیز مُسکراہٹ سے بولا۔ "اررررر! ناراض ہو گئیں آپ تو سچ مچ۔۔۔ اچھا بھئی! یہ پہاڑ کس قدر وحشت ناک ہیبت ناک اور خوفناک ہیں۔ ان کی چوٹیاں کس قدر عظیم الشّان ہیں اور قریب قریب آسمان کو چھُو رہی ہیں۔ اور وُہ چاند تو بالکل چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہے جیسے کسی کا چہرہ ہو۔ جھیل کا پانی ایسے چمک رہا ہے جیسے کسی الف لیلہ کی شہزادی کا آئینہ ۔۔۔ اور وُہ سفیدے کے رومان انگیز درخت کیسے چُپ چاپ کھڑے ہیں۔ یہ چاندنی ۔۔۔ یہ جھیل ۔۔۔ یہ فضا ۔۔۔ آہاہاہا ۔۔۔ نہ ہوا، یہاں عمر خیام ورنہ ضرور کوئی نہ کوئی فساد ہو جاتا۔"

اس نے سگریٹ سلگایا۔۔۔ ایک لمبا کش لیا اور سارا دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا۔ میں نے ذرا مُنہ بنایا۔ وُہ مُسکرانے لگا۔ میں بھی مُسکرا دی۔ وُہ آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگے۔ اُس نے پھر اپنا بازو سہارے کے لیے پیش کیا۔ اُترتے وقت کوئی تکان محسوس نہیں ہو رہی تھی پھر بھی میں نے سہارا لے لیا۔

اتوار کی صُبح کو ہم نشاط باغ جا رہے تھے۔ امّی کا ارادہ تھا کہ حامد وغیرہ کو بھی ساتھ لے چلیں۔ مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر وُہ لوگ گئے تو میں نہیں جاؤں گی۔

"آخر کیوں؟" امّی حیران ہو کر بولیں۔

"مجھے یہ لوگ زہر لگتے ہیں۔ یُونہی خوشامدی کہیں کے۔"

ایک مختصر سی بحث کے بعد یہی طے پایا کہ اُنہیں نہ بلایا جائے۔ مگر امّی اس روز متعجّب ضرور تھیں۔

تمام بچّے شکارے میں روانہ کر دیئے گئے۔ بزرگ پارٹی ایک دوسرے شکارے میں پہلے ہی جا چکی تھی۔ میں نعیم اور اشفاق تینوں چھوٹی کشتی میں چلے۔ اشفاق حسبِ معمول کشتی چلا رہا تھا۔

"بھئی جب جانیں، اُن شکاروں کو پکڑ لو" نعیم بولا۔ شکارے کافی دُور تھے۔

"فرض کیا پکڑ بھی لیں، پھر۔۔۔۔؟"

"ویسے ہی اکٹھے چلیں گے ذرا۔۔۔۔!"

"اور اگر اکٹھے بھی چلے۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔!"

مجھے ہنسی آ گئی۔

نعیم جھینپ گیا، بولا "ہوں، کہہ ہی کیوں نہیں دیتے کہ انہیں پکڑنا مُشکل ہے۔۔۔۔"

"اچھا۔۔۔تو یہ لو۔۔۔" اس نے پُل اوور اور کوٹ اُتار دیئے۔

ذرا دُور جاکر جرسی بھی اتار دی، وُہ نہایت تیزی سے کشتی چلا رہا تھا۔ سفید بنیان میں اس کا ترشا ہوا خوب صورت جسم کتنا اچھا لگا رہا تھا۔۔۔ بالکل جیسے یونان کے دیوتاؤں کے مجسمے ہوتے ہیں۔۔۔ چوڑا سینہ۔۔۔ گول شانے۔۔۔ اُبھری ہُوئی مچھلیاں۔۔۔ میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ میرے بازوؤں کو اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟ دیکھئے کہیں نظر نہ لگا دیجئے۔۔۔ نعیم میرا کوٹ تو دو ذرا۔"

نعیم ہنس پڑا۔۔۔ میں نے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔

"افّوہ! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ دیکھنا بالکل بند کر دیں۔ آپ شوق سے دیکھئے۔ مگر بس یہ خیال رہے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ چلئے میں کوٹ بھی نہیں پہنتا۔"

میں نے اپنا مُنہ بدستور موڑے رکھا۔ ہماری کشتی بڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ کتنا مغرور ہے یہ۔۔۔؟ میں بڑی دیر تک یہی سوچتی رہی۔۔۔ کہیں نظر نہ لگا دینا۔۔۔ اونہہ! مجھے پرواہی کیا ہے اس کی۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے، کہ کسی کے بازوؤں کی طرف دیکھوں۔

ذرا سی دیر میں ہم شکاروں سے جا ملے۔ مجھے اس پر غصّہ ضرور آرہا تھا مگر کبھی کبھی اسے کن انکھیوں سے دیکھ بھی لیتی تھی۔

نشاط پہنچ کر عجب دھماچوکڑی مچی۔ نوکروں نے ایک طرف مختصر سا کچن بنالیا۔ ساری پارٹی مختلف ٹولیوں میں منقسم ہوگئی۔ کہیں برج ہو رہا تھا، کہیں گراموفون بج رہے تھے۔ بچّے پھلوں پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ میں ایک فوّارے کے پاس اکیلی بیٹھی تھی۔ اشفاق اور امّی دوسرے پلاٹ سے باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔

"ارے! یہ اکیلی بیٹھی ہیں۔۔۔" وُہ بولا۔۔۔وہ بھی میرے ساتھ ہی آبیٹھے۔

"کیا سوچ رہی ہو تم؟" امّی نے پوچھا۔

"یہاں چاندنی رات میں کیسا لگتا ہوگا؟ مخمل جیسا سبزہ۔۔۔پھُولوں کے تختے یہ فوّارے!"

"خاک لگتا ہوگا! دو دو گز کے سانپ پھرتے ہیں یہاں چاندنی رات میں۔" وُہ بولا۔

"وُہ دیکھئے امّی جان، ڈل کی چمکتی سطح پر پھیکی سی دُھند پھیلی ہُوئی ہے اور ہلکے ہلکے بادل اِدھر اُدھر پھِر رہے ہیں۔ کتنی اچھی فضا ہے۔"

"بس سمجھ لیجئے! اسی فضا میں تو بے تحاشا مچھّر پیدا ہوتے ہیں۔" اُس نے امّی جان سے کہا۔

"اور امّی جان وہ نوک دار چٹان کیسی اُبھری ہُوئی ہے جیسے کسی پرندے کی چونچ ہو۔ اس جگہ سے کیسا اچھا نظّارہ دکھائی دیتا دے گا۔"

"اور اگر خدانخواستہ اسی خوبصورت چٹان سے پاؤں پھسل جائے تو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی بد قسمت یہاں آیا بھی تھا یا نہیں۔" وُہ بدستور امّی سے مخاطب تھا۔

میں جھنجھلا اُٹھی۔

"وُہ سامنے کنول کے پھولوں کا تختہ کتنا پیارا ہے؟۔ کیوں امّی؟ گہرے سبز پتّوں پر پھُول کتنے دل فریب لگ رہے ہیں!"

"شاید آپ کے لیے یہ باعثِ دلچسپی ہو کہ وہاں محض دلدل ہی دلدل ہے جس میں نہایت پیارے پیارے مگر مَچھ پھر رہے ہوں گے۔"

امّی ہنس پڑیں اور بولیں۔ "بھئی اگر تمہیں لڑنا ہی ہے تو مجھے کیوں درمیان میں رکھتے ہو۔ آمنے سامنے ہو کر اطمینان سے لڑو۔" یہ کہہ کر وُہ چل دیں۔

اشفاق کچھ دیر بالکل سنجیدہ بنا رہا۔ پھر سگریٹ سُلگایا اور ایک لمبا سا کش لگا کر سارا دھواں میرے ماتھے پر چھوڑ دیا۔ میں نے بڑا بُرا مُنہ بنایا۔

"بُرا مان گئیں آپ؟۔۔۔ یہ لیجئے!" اس نے جیب سے ایک بڑا سا چاکلیٹ نکالا، اُس کا کاغذ علیٰحدہ کرنے لگا۔

"شکریہ! میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"مگر میرا تو چاہ رہا ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں بھی چاکلیٹ نہ کھاؤں؟" اس کی بناوٹی ہنسی دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"آخر میں نے آپ کو منا ہی لیا۔ چلئے ریکارڈ بجائیں۔"

ہم دونوں چل پڑے۔ اس نے سہگل کا ریکارڈ "میں کیا جانوں کیا جادو ہے ۔۔۔ ان دو متوالے نینوں میں!" بجانا شروع کیا۔ میں نے کَن اَکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وُہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید چاہتا تھا کہ میں بھی اس کی طرف دیکھوں۔ مگر اب میری باری تھی۔ میں نے مُنہ پھیر لیا۔

ریکارڈ بج رہا تھا۔۔۔ "جب نین ملے نینوں نے کہا۔"

میں نے جان بوجھ کر نعیم کو آواز دی ”بھئی ذرا وُہ سینڈوچز کی ٹوکری یہاں دے جانا اور وُہ تھرماس بھی۔“

اُس نے ساؤنڈ بکس اُٹھایا اور ریکارڈ شروع سے لگا دیا۔۔۔۔!

پھر وہی الفاظ۔۔۔ ”نینوں نے کہا۔۔۔۔اب نین بسیں گے نینوں میں۔“ میں جلدی سے بولی۔ ”دیکھو ننھی اگر تم نے یہ چھلانگ بند نہ کیں تو تم پِٹ جاؤ گی۔۔۔“

میں نے دونوں مرتبہ ریکارڈ کی آواز سُنی اَن سُنی کر دی۔

اُس نے پھر ساؤنڈ بکس اٹھا کر ریکارڈ کے شروع میں رکھ دیا۔

”نینوں نے کہا۔۔۔جب نین ملے۔۔۔!“

میں اُٹھ کھڑی ہُوئی اور دوڑ کر ننھی کو گود میں اٹھا لیا۔

میں چاہتی تھی۔۔وُہ یہ کہے۔۔۔۔ ”آپ یہ ریکارڈ سُنتی کیوں نہیں؟“

مگر اس نے بڑے اطمینان سے گراموفون بند کر دیا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی بجاتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔

میں اُسے واپس بلانے ہی لگی تھی مگر رُک گئی۔ آخر مجھ میں بھی تو خودداری ہے۔ اس میں کون سا سُرخاب کے پَر لگے ہوا ہے۔ آخر اُس نے یہ ریکارڈ بجایا ہی کیوں تھا۔ عجیب معمّہ ہے۔ اگر اُسے مجھ سے نفرت ہے تو اس قسم کی چھیڑ کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ اور اگر اسے میرا کچھ خیال ہوتا تو یہ بے رُخی!

اس کے بعد شام تک وُہ ابّا کے ساتھ برج کھیلتا رہا۔ مگر مجھے انتظار ہی رہا کہ وُہ کب آتا ہے۔

اگلے روز صُبح صُبح وُہ اور نعیم کشتی لیے سیر کو جا رہے تھے۔ اُس نے حامد کو بھی بُلا لیا۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ یہ بالکل نیچے تھے۔ آسمان پر گھٹا تھی۔

"آیئے! آیئے!!" اُس نے حامد کا استقبال کیا۔

حامد دھم سے عجیب بدتمیزی سے، کشتی میں بیٹھ گیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا:

"مطلع کچھ کچھ ابر آلود ہے، یہ اندیشہ میرے دل میں ترقّی پاتا جا رہا ہے۔ کہ تعجّب نہیں جو ان سُرمئی بادلوں میں سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح بکھر جائیں گے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔" اشفاق بولا۔

"مگر بادِ مخالف بھی جوبن پر ہے اور اغلب ہے کہ ہمارا سفینہ اسی جھیل بے کراں یا بالفاظِ دیگر آب بے پایاں میں اُلٹ نہ جائے اور ہم!۔۔۔"

"اور ہم ڈوب نہ جائیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھئی تمہیں تو میں بچالوں گا۔" اشفاق ہنس کر بولا۔

"اس جھیل کی سرد فضا، اور خنک، کہر آمیز بخارات کا اثر جسم انسانی پر نمونیے کی صورت میں تو ظاہر ہوا کرتا ہے۔" حامد ڈرتے ڈرتے بولا۔

"جسے نمونیہ ہوتا ہونا ہے، اسے کمرے میں انگیٹھی کے پاس بھی ہو جاتا ہے۔" نعیم بولا۔

"لو میرا کوٹ لے لو!۔" اشفاق نے کوٹ اُتار دیا۔

"کیا آپ وثوق سے فرماسکتے ہیں کہ بندے کے جسمِ ناتواں کے لیے ایک کوٹ ہی اکتفا کر سکے گا۔"

"تو یہ پُل اور مفلر بھی لے لیجئے۔"

"اور آپ؟" حامد حیرت سے بولا۔

"میرے پاس کافی مسالہ ہے"۔ اُس نے اپنے پٹھے اکڑاتے ہوئے کہا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

اُس احمق نے جلدی سے سب کچھ پہن لیا اور دُبک کر بیٹھ گیا۔

اشفاق نے صرف ایک آسمانی رنگ کی جرسی پہنی ہُوئی تھی۔ جس میں سے اُس کے سفید سفید مضبوط بازو چمک رہے تھے۔ حامد بالکل مُرغا بنا بیٹھا تھا۔

میں پڑھنا بھُول گئی اور انہیں دیکھنے لگی۔ حامد اور اشفاق دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھے تھے۔ کتنا فرق تھا دونوں میں۔ ایک زندہ دِلی کا مجسمہ تھا اور دوسرا بالکل چُغد۔

اشفاق کشتی چلا رہا تھا۔ ---دراز قد--- چوڑا چکلا سینہ، ورزشی جسم، ہنس مکھ--- ہر وقت ایک ہلکا سا تبسم ہونٹوں پر رہتا تھا۔ جیسے بھی کپڑے پہن لے وہی سج جاتے ہیں اور نیلے سوٹ تو اتنے سجتے ہیں کہ نظروں میں کھُبنے لگتا ہے۔

اُدھر حامد---بالکل ہی اس کا جواب، ہر وقت بسور رہے ہیں، اوّل نمبر کے ڈرپوک جسم--- وُہ بھی ڈھیلا اور غیر متناسب، چھوٹا سا قد-موٹی اور لمبی ناک--- سانولا رنگ--- کہیں باہر جانے سے پہلے آدھ آدھ گھنٹے تک میک اپ کریں گے۔ مُنہ پر کریمیں مل رہے ہیں۔ ہر وقت یہی کوشش ہے کہ کسی

طرح بال گھنگھریالے بن جائیں۔۔۔۔ بھلا اگر کسی روز بن بھی گئے۔ تب کون سا فرق پڑ جائے گا۔ پہلے ہی بالکل زنانہ حلیہ ہے۔۔۔۔ چل رہے ہوں گے۔ تو یہ خیال ہو گا کہ کہیں پاؤں میں موچ نہ آ جائے۔ کھیل کود کے پاس بھی نہیں پھٹکیں گے۔ اوّل درجے کے بد دماغ۔۔۔ غلط فہمی کے شکار۔۔۔ کر کچھ بھی نہیں سکتے اور ڈینگیں اس قدر مارتے ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں۔ مجھے شروع ہی سے نفرت تھی۔ اگر کوئی سہیلی مجھے اُس کے نام پر چھیڑتی تھی۔ تو مجھے بجائے فخر کے شرم آ جاتی تھی، ایسے ایسے ثقیل فقرے بولتے ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لیے کم از کم انسان کو منشی فاضل ہونا چاہیے۔

اِدھر اشفاق!۔۔۔۔ جیسے اب تک مجھے اس کا انتظار تھا۔ بالکل میرے خوابوں کی تعبیر! ویسے میں جانتی تُو اسے کئی برس سے تھی مگر مجھے یہ اتنا اچھا کبھی نہیں لگا تھا۔ اسے بھی شاید میرا خیال ہو۔ مگر خیال ہوتا تو ایک ٹیڑھی تِرچھی باتیں کیوں کرتا۔۔۔۔ بڑا بے پرواہ ہے۔ بے پروائی کی بھی کوئی حد ہوا کرتی ہے۔ میں کافی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ پھر دوسرے کمرے میں قدِّ آدم شیشے کے سامنے جا کھڑی ہُوئی۔ میری ناک۔۔۔ کیسی سُتواں ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں جنہیں میری سہیلیاں نشیلی کہا کرتی ہیں۔۔۔۔ قد بھی کتنا اچھا ہے اور رنگ؟۔۔۔ کافی کھلتا ہوا ہے جس میں گلابی آزمائش بھی ہے۔ کئی لڑکیاں اسے چمپئی بھی کہا کرتی

ہیں۔ میرے بال۔۔۔۔ جن کی لٹوں کا چرچا ہر وقت کلاس میں رہتا ہے۔ آخر کیا نہیں ہے مجھ میں، اپنے کالج میں خوبصورت ترین گردانی جاتی ہوں، یہ احمق حامد تو مجھ پر نظمیں لکھا کرتا تھا۔ پاگل کہیں کا، اپنی طرف سے شاعری کیا کرتا ہے تعریف کرتے کرتے مجھے عرش تک پہنچا دیتا ہے۔

آخر یہ بال، یہ رنگ، یہ آنکھیں۔۔۔ یہ سب اشفاق کو کیوں اچھّے نہیں لگتے۔ یہ ہی کونسا نرالہ ہے؟ ۔۔۔۔میں جھنجھلا اُٹھی ۔۔۔۔ہوں نشیلی آنکھیں،۔۔۔۔ چمپئی رنگ، لہراتی ہُوئی لٹیں۔ سب غلط ! اب تک مجھے غلط فہمی رہی ہے۔۔۔۔ کون کہتا ہے میں خوبصورت ہوں؟ اگر ہوتی تو اِسے نہ لگتی؟ اسے تو میرا ذرا سا بھی خیال نہیں ہے! مگر اتنی لڑکیاں غلط کہتی تھیں کیا؟۔۔۔

ادھر حامد سے منگنی۔۔۔۔ والد صاحب نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا تھا۔ میں نے رضامندگی آج تک ظاہر نہیں کی تھی۔ یونہی ٹال مٹول کر جاتی تھی۔ اگر اشفاق مجھ میں ذرا سی بھی دلچسپی ظاہر کرتا تو میں نے کبھی کا والد صاحب سے کہلوا دیا ہوتا کہ وُہ حامد کو جواب دے دیں۔ مگر کیا یہ چاہتا ہے کہ میں خود دلچسپی ظاہر کروں۔۔۔ یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہو ہی کسی طرح سکتا ہے۔ میں اس پر

موت کو ترجیح دوں گی۔ اگر اسے اپنے اُوپر غرور ہے تو ہوا کرے۔ مجھ میں بھی تو غرور ہے۔، کیا میں اُس سے ہار جاؤں گی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اشفاق اور حامد دونوں ہمارے مختصر سے ڈرائنگ روم میں باتیں کر رہے تھے۔ ابّا بازار گئے ہوئے تھے۔ امّی شاید سو رہی تھیں۔ میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ان دونوں کی باتیں سُنوں۔ آخر کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔

میں دبے پاوں ساتھ والے کمرے میں پہنچی اور ایک کتاب لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔۔۔ان دونوں کی آواز صاف آرہی تھی۔

حامد بولا: ”نہ معلوم مجھے فطرتاً کیوں حساس طبیعت ودیعت ہوتی ہے اور جذبات سے لبریز دل، جس میں لمحہ لمحہ کے بعد طوفان آتے ہیں، جو خیالات کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتے ہیں اور دیر تک انتشار سا رہتا ہے۔“

”اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کو حساس ہونا بھی چاہے۔ ورنہ آدمی اور جانور میں فرق ہی کیا ہوا؟“ اشفاق بولا۔

”میری موقع بے موقع سنجیدگی کی یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر مجھے یہ دنیائے فانی محض تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں لگتی۔“ حامد نے کہا۔

"آپ کی شکل کچھ کچھ رڈولف ویلنتینو مرحوم سے ملتی جُلتی ہے۔"

"اور آپ حیران ہوں گے کہ یہی الفاظ مجھ سے کئی حضرات کہہ چکے ہیں۔" حامد بولا۔

"مگر جب آپ ہنستے ہیں تو بالکل راجرز نو دیرد لگتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ غالباً آپ کا قیاس کسی حد تک صحیح ہے۔ اگرچہ میں گاہے بگاہے ہنسنے کا شوق کیا کرتا ہوں۔ تاہم وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بعض اوقات مجھے خود بھی یہی احساس ہوتا ہے۔"

مجھے حسرت ہی رہی کہ کبھی اُسے بھی ہنستا دیکھوں۔

"اور پرسوں جب آپ نوکر پر ناراض ہو رہے تھے تو بالکل جان گلبرٹ مرحوم دکھائی دے رہے تھے۔" اشفاق بولا۔

"خیر ہو سکتا ہے۔ میں نے ایسے غیر ضروری مسائل پر غور کرنا قابلِ توجّہ نہیں گردانا۔ تاہم میرا شُبہ یقین میں تبدیل ہوا چاہتا ہے کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہو گا۔ مجھے اوائل عمر سے ہی شوق رہا ہے کہ اپنے جذبات کا اظہار ایکٹنگ میں کیا کروں، مگر میں معافی کی گزارش پیشِ خدمت کر کے جسارت کروں گا اور مجھے اندیشۂ کامل

ہے کہ شاید یہ اختلاف آپ کی طبعِ نازک کو گراں محسوس ہو۔۔۔وُہ یہ کہ مجھے جان گلبرٹ مرحوم کبھی حسین و جاذبِ نگاہ معلوم نہیں ہوا۔ مگر میں ایک آرٹ کا شیدائی ہوتے ہوئے ہر آرٹسٹ کی قدر کرنا اپنا اوّلین فرض تصور کرتا ہوں۔"

"بہت خوب! مجھے بھی ایک عرصہ یہی خبط رہ چُکا ہے۔، مگر حسرت ہی رہی۔ بُرا ہو اس لمبے قد کا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔" اشفاق بولا۔

"ہاں میرا ذاتی نظریہ بھی اسی قسم کے حقائق کا شاہد ہے کہ دراز قد انسان عموماً فنونِ لطیفہ سے بے بہرہ ہوتا ہے اور اگر خدانخواستہ بصورتِ دیگر وُہ کوشش بھی کرے، تب بھی وُہ کسی جذبۂ بے اختیار کے ماتحت اس مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

میں اس فقرے کو بہت دیر کے بعد سمجھ سکی۔

"جی ہاں! اور جب کبھی میں کوشش کرتا ہوں کہ فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لوں تو یہ بے تُکا قد، لمبوترا چہرہ اور یہ غیر رومانی حرکتیں۔ سب چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ بھئی تو صبر کرلے تو بہتر رہے گا۔"

"آپ کی لطیف گفتگو سے جسے میں قصداً جرأت کرتے ہوئے صرف مزاحیہ کہہ دینے پر اِکتفا کروں گا، اس میں نہ صرف کسی قدر سچائی کی جھلک ہے بلکہ اگر

میں ذرا آگے چلا جاؤں تو اس میں قدرے کسرِ نفسی کا مادہ بھی پنہاں ہے، جسے ہر ذی ہوش انسان انتہائی آسانی کے ساتھ پہچان سکتا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ غالباً آپ نے اپنی عُمر اب تک محبّت کے روح پرور اثرات اور دل آویز دل گداز خیالات سے لامتناہی فاصلے پر رہ کر ضائع کی ہے۔ اور میرے دل میں یہ اندیشہ تخلیق پا گیا ہے کہ شاید آپ اسی قسم کے اثرات کے زیرِ سایہ رہ کر نہ صرف اپنی عمر کے اس بیش قیمت حصّے کو محض ضائع کر دیں گے بلکہ اپنے دل، اپنی روح اور اپنے دماغ سب کو اس لطیف غذا سے محروم رکھ کر ناکارہ کریں گے۔"

مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بھلا کہاں محبّت اور کہاں میں !جی قبلہ !ہمیں کیا پتہ محبّت ہے کیا چیز؟ آپ کا نظریہ حرف بحرف صحیح ہے۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ بھلا مجھ جیسے شخص سے کون بد مذاق ہستی محبّت کر سکتی ہے؟"

"اس صورت میں جبکہ انسان محبّت کا اہل کسی زاویہ نگاہ سے بھی قرار نہ دیا جا سکے اور تلخی و ناکامی سائے کی طرح اس کا تعاقب کر رہی ہوں، ایسی صورت میں مذکورہ حالات کا اعتراف کر لینا، نہ صرف باعثِ سکونِ قلب ہے بلکہ کسی حد تک باعثِ تحسین و آفرین بھی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ جلّ جلالہ سے نااُمّید اور مایوس ہونا

کفرِ عظیم ہے۔ اس صورت میں حقیر انسان کا فرضِ منصبی میں ہے کہ وُہ ناکامیابی کی تلخیوں پر فاتحانہ انداز سے تبسّم ریز ہوتا ہو۔ اُمید کے قلعے میں محصور ہو کر کامیابی کے لیے کوشاں رہے۔“

یکا یک مجھے امّی کی آواز سُنائی دی۔ شاید مجھے بُلا رہی تھیں۔ مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ بمشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ وہاں سے چھٹکارا پاتے ہی میں واپس بھاگی اور اسی کمرے میں جا پہنچی۔ کان لگا کر سُننے گی۔ حامد بول رہا تھا۔

”غالباً اس وقت آپ کے مایوس اور پژمردہ دل میں ولولہ انگیز جذبے کا ایک ہیجان بپا ہو گا۔ خدائے پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ہیچمدان کی مساعی ثمر بار ثابت ہوئیں اور آپ کو سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔ آئندہ اس قسم کا تبادلۂ خیالات میرے لیے باعثِ راحت و مسرّت ہو گیا۔ کسی ذی جاں کو غم و الم و افکار کے بارِ عظیم سے نجات دِلا کر میرے دل کو جو روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے ۔۔۔اس کا اندازہ؟ آہ! کس فانی کی طاقت ہے کہ اس کا صحیح طور پر تخمینہ کر سکے۔“

"میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے سچ مچ میرا آدھا دُکھ دُور کر دیا۔ آج کل ہندوستان کو آپ جیسے سپوتوں کی ضرورت ہے۔ اور پھر مہاتما گاندھی کی بھی تو یہی پالیسی ہے۔"

میں نے کواڑ کی درز میں سے دیکھا۔ اُس نے اپنا چہرہ اتنا سنجیدہ بنا رکھا تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ کتنا دلچسپ ہے یہ؟ ہر رنگ کا بہروپ بھر لیتا ہے۔ حامد کے ایک ایک فقرے پر میں ہنسی سے دوہری ہُوئی جا رہی تھی اور یہ کتنی سنجیدگی سے سُن رہا تھا؟۔۔۔

اگلے روز کا ذکر ہے۔ ابّا فوٹو گرافر سے چند نئے پرنٹ لائے تھے۔ میں بیٹھی انہیں البم میں لگا رہی تھی۔ نعیم کیمرہ لیے بیٹھا تھا۔۔۔ اشفاق آ گیا۔۔۔۔ میرے ہاتھوں سے البم کھینچ لی اور لگا دیکھنے۔ جلدی جلدی دیکھ کر بولا: "کچھ نہیں۔ یہ بھی البم ہے۔ اوّل تو جس نے تصویریں لگائی ہیں اسے فوٹو گرافی کے متعلق کچھ پتہ ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ تصویریں آدھی دُھندلی ہیں اور آدھی سیاہ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی مُلک کی اور کسی قسم کے باشندوں کی تصویریں ہیں۔ اگر میرا البم کوئی دیکھے تو دنگ رہ جائے۔"

"تو آپ کا البم یہیں ساتھ ہے کیا؟" نعیم للچا کر بولا۔

"ہاں ہے تو ساتھ ہی، مگر میں خاص خاص آدمیوں کو دکھایا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وُہ جانے لگا۔

میں نے نعیم کو اشارہ کیا۔۔۔ اور آہستہ سے اُسے کہا "جب جائیں البم لے ہی آؤ۔"

نعیم بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ جب شام کو واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا خوبصورت سا البم تھا۔ ہم دونوں آدھی رات تک تصویریں دیکھتے رہے۔ واقعی تصویریں بہت ہی اچھی تھیں۔ آدھا البم تو اس کی اپنی ہی تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی کوئی تصویر تو اتنی اچھی تھی کہ جی میں آتا تھا کہ نکال لوں۔۔۔۔ البم کو تین چار مرتبہ دیکھ کر نعیم تو سو گیا۔ مگر میں جاگتی رہی۔ اُس کی ایک تصویر پر میری نظریں جم گئیں۔ کچھ بھی ہو۔ اسے تو ضرور نکال لینا چاہیئے۔۔۔ مگر وُہ اپنے دل میں کیا سوچے گا۔ بغیر پوچھے تصویر رکھ لی۔ دوسرے الفاظ میں تصور چُرا لی۔ کافی دیر تک اسی کشمکش میں رہی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے وُہ تصویر نکال ہی لی۔ دوسرے روز نعیم نے البم واپس کر دیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

شاید تیسرے روز کا ذکر ہے ہم سہ پہر کی چائے پی رہے تھے۔ ابّا کسی سے ملنے گئے ہوئے تھے اور نعیم نوکر کے ساتھ بازار گیا ہوا تھا۔ اتنے میں اشفاق آ گیا اور چائے میں شریک ہو گیا۔

"آج میں آپ کو ایک دلچسپ قصّہ سناتا ہوں۔"

امّی پہلے ہی سے مُسکرا دیں اور جلدی سے بولیں "ہاں ہاں سُناؤ بھئی۔"

"آج کی گفتگو کا موضوع ہے چوری۔۔۔ چوری کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ۔۔۔روپوں کی چوری۔۔۔ امرودوں کی چوری۔۔۔ افسانوں کی چوری وغیرہ وغیرہ۔ مگر آپ نے ایک خاص قسم کی چوری بھی سُنی؟"

"وُہ کون سی۔"

"تصویروں کی چوری۔" وُہ مُسکرا رہا تھا اور میرا دم خشک ہو گیا۔

"اور پھر خود ہی سوچیے ذرا۔ کتنا بُرا لگتا ہے کہ کوئی غریب بڑے اہتمام سے بہترین کپڑے پہن کر بہترین فوٹوگرافر سے ۔۔۔بہترین پوز میں تصویر کھنچوائے۔ اور کسی کے دل میں نہ معلوم کِس قسم کی گُدگُدی اُٹھے اور وُہ تصویر خواہ مخواہ چُرا لے۔"

میری تو بس جان ہی نکل گئی۔ کیا یہ سب کچھ امّی سے کہہ دے گا؟ وُہ کیا سوچیں گی دل میں؟

"کیا ہوا مذاق ہی مذاق میں تصویریں بھی چُرا لیتے ہیں۔" امّی بولیں۔

"یہ مذاق کی بھی ایک ہی رہی، کم از کم مجھے تو اس مذاق میں کوئی جاذبیت دکھائی نہیں دیتی اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی تصویر چوری ہو جانے پر تو اس بات کو ترجیح دوں گا کہ کوئی براہ راست مجھے ہی چُرا لے۔ دیکھئے نا! وُہ میری ایک نہایت اچھی تصویر تھی۔"

"تو کیا وُہ کسی نے چُرا لی؟" امّی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بڑے اطمینان سے چُرا لی اور رسید تک نہ دی۔ پہلے تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ مگر بعد میں پتہ ہے میں نے کیا کِیا؟"

"کیا کیا تُم نے؟" امّی بدستور مُسکرا رہی تھیں۔

"آپ ہی فرمایئے مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟"

"تم بھی اس کا کچھ چُرا لیتے۔"

"جی ہاں! بس میں نے بھی اس کا کچھ چُرا لیا۔ میں نے چپکے سے اس کی بہترین تصویر چُرا لی۔ ٹھیک کیا نا میں نے؟"

"بڑا اچھا کیا۔ ایسے کو تیسا!۔" امّی نے اس کے سامنے کیک سرکاتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے اس سے نمٹ لو۔"

میں جلدی سے بہانہ بنا کر اُٹھی اور سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ سوٹ کیس جو کھول کر دیکھتی ہوں تو بس دھک سے رہ گئی۔ میری تصویر غائب تھی۔ ۔۔۔پوری کیبنٹ سائز کی تصویر اور تھی بھی بس ایک ہی کاپی۔ کئی سہیلیوں کو میں نے محض اس تصویر پر ناراض کیا تھا۔ وُہ کہتی تھیں۔ یہ میری بہترین تصویر ہے۔ جہاں مجھے افسوس ہو رہا تھا، وہیں دل کے ایک گوشے میں مسرّت بھی کروٹیں لے رہی تھی۔

دوسرے روز صُبح کے وقت بوٹنگ پر جاتے ہوئے وُہ کہنے لگا۔ "میں پرسوں واپس جا رہا ہوں۔"

"ہیں! واپس جا رہے ہیں؟" ابّا تعجب سے بولے۔ "اتنی جلدی؟"

"جی ہاں! اگر آپ سب نہ ملتے تو کبھی کا چلا گیا ہوتا۔"

"مگر ابھی تمہاری دو تین ہفتے کی چھُٹیاں باقی ہیں!"

"ہیں تو سہی، مگر ابھی دو تین جگہ اور چکّر لگانے ہیں۔"

"نمائش دیکھ کر جانا اگلے ہفتے ہی تو ہے!"

"جی نہیں، اگر نمائش دیکھنے ٹھہر گیا تو شاید چھٹیاں یہاں ہی گزر جائیں۔"

گھر میں تقریباً سب نے ٹھہرنے کو کہا مگر وُہ نہ مانا۔ سیلانی طبیعت نے زور مارا ہو گا کہ کہیں اور پھریں گے۔

دوپہر کو واپس جاتے وقت بولا "لاحول ولا قوۃ میں بھُول ہی گیا۔"

"کیا بھُول گئے؟" امّی بولیں۔

"اجی امّی جان نے ان کے لیے کچھ بھیجا تھا۔"

"نجمہ کے لیے؟"

"جی ہاں، انہی کے لیے۔"

کچھ بھیجا تھا۔۔۔ میں چونک پڑی۔

”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ کالج سے سیدھے یہاں آرہے ہو۔ پھر وُہ کچھ کہاں سے لے آئے؟“

”میں گیا تو تھا وہاں!“

”کہاں؟“

”میرا مطلب ہے، میرا ارادہ تھا کہ وہاں جاؤں۔۔۔۔ دیکھئے نا۔۔۔۔ انہوں نے خود ہی کسی کے ہاتھ بھجوا دیا۔ پچھلے مہینے بھیّا لاہور آئے تھے۔ وُہ ساتھ لے آئے۔“

”بس خواہ مخواہ ان کو ہمیشہ سے یہی عادت ہے۔ بھلا لگاتار تحفے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر نجمہ بھی تو ان ہی کی لڑکی ہے۔“

”ذرا داد دیجئے میرے حافظے کی۔۔۔۔ مجھے خیال ہی آج آیا ہے۔“

”وُہ کیا چیز ہے بھلا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے خود کچھ پتہ نہیں البتہ کچھ ہے ضرور۔“

میرا اشتیاق بڑھتا جارہا تھا۔

”وُہ چیز کتنی بڑی ہے، کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں؟“

"یونہی معمولی سی ہے نہ بہت بڑی ہے اور نہ بالکل چھوٹی۔"

"اس کا رنگ کیا ہے؟ اور اس کی شکل کیسی ہے؟"

"اس وقت تو مجھے اچھی طرح پتہ نہیں، ہاں ہے کچھ خوبصورت سی۔"

"ذرا دماغ پر زور ڈالئے۔۔۔ بھلا وُہ چیز گول ہے، چوکور ہے یا تکونی۔۔۔۔ وُہ پتلی ہے یا موٹی۔۔۔ اور ملائم ہے یا سخت؟"

امّی جان ہنس دیں۔ "آخر اس قدر بے صبر ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جو کچھ بھیجا ہو گا شام کو آ جائے گا۔"

وُہ چلا گیا میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ تحفہ بھیجا ہے؟ مجھے؟ اور پھر اس کے ہاتھ؟ خود بھی تو بھیج سکتی تھیں۔ ابھی دو چند مہینے بھی نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے ایک سنہری "نیک لیس" میرے لئے بھیجا تھا۔۔۔ اتنی جلدی دوسرا تحفہ۔۔۔ واقعی اُنہیں میں بہت اچھی لگتی ہوں۔۔۔ وُہ ہمیشہ میری تعریفیں کیا کرتی ہیں۔ میرا دل مسرّت سے لبریز ہو گیا۔۔۔ غرور سے میرا سر اُونچا ہو گیا۔

شام کو امّی اور ابّا شاپنگ کرنے چلے گئے۔ نعیم کشتی لے کر کہیں نکل گیا۔ میں اکیلی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کھڑکی سے جھانک جھانک کر میری گردن دکھنے لگی تھی۔

اُس نے دوسرے کنارے سے اشارہ کیا اور ہمارا نوکر شکارا لے کر اُسے لینے چلا۔

میں اُٹھ کر چھوٹے سے برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ آیا مُسکراتا ہوا۔۔۔ زردی مائل قمیص، ویسی ہی پتلون، چوڑی دھاریوں کا کھلاڑیوں والا کوٹ پہنے ہوئے۔۔۔ گلے میں ایک شوخ رنگ کا مفلر تھا۔۔۔ وُہ کیسا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اِدھر آیئے"!

میں اس کے پاس چلی گئی۔

"یہاں بیٹھ جایئے!"

میں اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"یہ کچھ بھیجا ہے امّی نے۔" اس نے ایک چھوٹا سا ڈبّہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی سنہری گھڑی چمک رہی تھی۔

"اور انہوں نے مجھے یہ تاکید بھی کی تھی کہ میں خود آپ کو پہنا دوں۔ لایئے اپنی کلائی۔"

میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔۔۔ اُس نے میرا داہنا ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا اور گھڑی باندھ دی۔ میں نے اپنا ہاتھ وہیں رہنے دیا۔

"ارے یہ تو داہنا ہاتھ تھا! میں بھی کتنا بدحواس ہُوں۔" میں ہنس پڑی۔

اس نے بائیں ہاتھ پر گھڑی باندھ دی۔ میرے دونوں ہاتھ اُس کی گود میں رکھے تھے۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا اور ایک سرد شام کو مجھے پسینہ آگیا۔

"کیسی ہے؟"

"بہت پیاری ہے۔" میں بولی۔

"آپ سے بھی زیادہ؟" اُس نے آہستہ سے کہا اور سارے جسم کا خون سمٹ کر میرے چہرے پر آگیا۔

میں نے گردن جھکالی۔ اُس نے سگریٹ سلگائی اور حسبِ معمول ایک لمبا سا کش کھینچا اور سارا دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا۔

"مجھے اس کی بُو ذرا اچھی نہیں لگتی۔" میں نے مُنہ بنا کر کہا۔

"مگر مجھے تو اچھی لگتی ہے۔۔ ارے یہ سب لوگ کہاں گئے؟"

میں نے بتا دیا۔

"بھئی میرا جی تو کشتی چلانے کو چاہتا ہے۔ اِدھر نعیم صاحب کشتی سمیت لا پتہ ہیں۔"

"ابھی آ جائے گا۔ کچھ دیر انتظار کیجئے۔"

"تو پھر اتنی دیر کیا کیا جائے۔ اچھا ایک آدھ ریکارڈ ہی سُنا دیجئے"! میں اٹھی اور سوچنے لگی، کون سا ریکارڈ بجاؤں۔۔۔ نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہی سہگل کا ریکارڈ۔۔۔ میں کیا جانوں کیا جادو ہے۔۔۔ لگا دیا اور اُس کے سامنے صوفے پر جا بیٹھی۔۔۔ ریکارڈ بج رہا تھا۔۔۔ من پُوچھ رہا ہے اب مجھ سے۔۔۔ نینوں نے کہا ہے کیا تجھ سے۔۔۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وُہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس دفعہ میں نظریں اس کے چہرے سے نہ ہٹا سکی۔۔۔ جب نین ملے۔۔ نینوں نے کہا۔۔۔ اب نین بسیں گے۔۔۔ نینوں میں۔

اس کے بعد پتہ نہیں کہ ہم نے کتنی دفعہ اس ریکارڈ کو بجایا اور کتنی دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا۔ میں کہاں بیٹھی ہوں۔۔۔ بس میری نظروں کے سامنے دو آنکھیں تھیں جو مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں بالکل

مدہوش ہوگئی۔ نعیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔۔۔ میں جیسے ایک دلفریب خواب سے چونک پڑی۔ شاید وُہ کشتی لے کر واپس آگیا تھا اور اشفاق کو بُلا رہا تھا۔

"آیئے، ایک چکّر اور لگا آتے ہیں۔" نعیم نے آواز دی۔

"ابھی آیا۔۔۔۔" اشفاق نے کوٹ اور مفلر وہیں صوفے پر ڈالے اور مجھے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ میں کچھ کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی۔۔۔۔ پھر اس کا مفلر اُٹھالیا اور اُس سے کھیلتی رہی۔ جب اُس سے تھک گئی تو کوٹ اُٹھالیا۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ اُوپر کی جیب میں ایک کاغذ تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اُسے کھولا۔۔۔ میری نظریں اُس پر جم کر رہ گئیں۔۔۔۔ کسی مقامی جوہری کی رسید تھی۔۔۔۔ ایک سنہری گھڑی کی فروخت کی۔۔۔۔ قیمت بھی لکھی تھی۔۔۔۔ اڑتالیس روپے۔۔۔۔ اور تاریخ بھی آج ہی کی تھی۔۔۔۔ میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔۔۔۔ آنکھوں کے سامنے حروف ہلنے لگے۔۔۔۔ کیا یہ سچ ہے؟۔۔۔۔ کیا اشفاق جھوٹ بول رہا تھا۔۔۔۔ اور امّی کا نام ویسے ہی لے رہا تھا، جھوٹا کہیں کا۔۔۔۔ پرلے درجے کا مکّار۔۔۔۔ مجھے اس پر اس قدر غصّہ آرہا تھا کہ بس، اُونہہ امّی جان نے بھیجی ہے۔۔۔ اور خود پہنانے کی تاکید کی تھی۔۔۔۔ بھلا اُنہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہر مہینے میرے لیے ایک تحفہ

بھیجیں۔۔۔ غم و غصّے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔ آخر اس قدر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت کیا تھی۔ وُہ تحفہ دینا چاہتا تھا۔ مگر اُسے اندیشہ تھا کہ شاید میں قبول نہ کروں۔ اس لیے اُس نے یہ ڈھونگ رچایا۔ میرے سامنے اب دو ہی باتیں تھیں۔ یا تو گھڑی واپس دے دوں یا اتنے روپے اس کی جیب میں ڈال دوں۔۔۔ اسے قبول کرنے میں میری شکست پنہاں تھی۔ اگر یہ مجھے اپنی طرف سے پیش کرتا تو شاید میں لے لیتی۔۔۔ مگر اسے واپس کرنے میں مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے ہمیشہ کے لیے نہ کھو دوں۔ میں نے یہی فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو۔ مگر شکست ہرگز نہ مانوں گی۔ کیا میں وہی نجمہ نہیں ہوں جس کی خودداری کالج بھر میں مشہور ہے اور جس کی ضد کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹھہرتا۔۔۔ جس نے کبھی کسی کا احسان نہیں اُٹھایا۔ کیا میں بدل گئی ہُوں۔ کیا میں اُس بے پروا اور مغرور سے ہار جاؤں گی؟ بالکل نہیں۔۔۔ میں نے مٹھیاں کس لیں اور مصمّم ارادہ کر لیا کہ بجائے کوٹ میں ڈالنے کے گھڑی اُسے علیٰحدہ بُلا کر واپس کر دوں!

ڈیڑھ دو گھنٹے تک وُہ واپس آ گیا۔ ابّا بھی آ گئے تھے۔ وُہ بار بار نظریں بچا کر مجھے دیکھ رہا تھا مگر میں نے ایک مرتبہ بھی اُس کی جانب نہیں دیکھا۔

کھانے کے بعد جب وُہ جانے لگا تو میں پہلے ہی ڈرائنگ روم میں پہنچ چکی تھی۔ وُہ جلدی میں تھا اور شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا اور جلدی جلدی کوٹ پہنے لگا۔

"ذرا سُنئے!" میں نے آہستہ سے کہا۔ میری مٹھی میں گھڑی تھی۔ وُہ لپک کر میری طرف آیا۔

"آج آپ چُپ کیوں تھیں؟"

"دیکھئے!" میں نے آواز سنجیدہ بنا کر کہا: "بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔۔!"

"بات یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہیں۔۔۔" اُس نے بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔

وُہ مُسکرا رہا تھا "بتایئے بھی اب بات کیا ہے؟"

میں نے اپنی مُٹّھی کھول دی!

"ارے یہ گھڑی تم نے اُتار دی۔۔۔ مجھے آخر کتنی دفعہ پہنانی ہو گی؟"

بیشتر اس کے کہ میں کچھ بولتی۔ اُس نے جلدی سے گھڑی باندھ دی اور میرے دونوں ہاتھ دبا کر بولا۔ "کیا کہنا چاہتی تھیں آپ؟۔۔۔" اس کی آنکھوں میں مسرّت ناچ رہی تھی۔

کیا تو غصّے سے بھری بیٹھی تھی اور کیا اُس کا ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ سارے شکوے شکایتیں بھُول گئی۔ جیسے کوئی بات تھی ہی نہیں۔

"اب بتایئے بھی، وُہ کون سی بات تھی؟"

میں بدستور خاموش کھڑی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ "اپنی طرف سے تو بڑی سنجیدہ بنی ہُوئی ہیں۔۔۔ افسوس یہ ہے کہ میرے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں، ورنہ ضرور آپ کو دھوئیں میں نہلا دیتا۔"

"بات یہ تھی کہ کل آپ ضرور آئیں گے نا؟"

"بس صرف اتنی ہی؟ میں سمجھا خُدا جانے کون سا سنگین معاملہ ہے۔ اچھّا اچھّا آنکھیں بند کیجئے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اور مٹھی کھولئے!"

میں نے مُٹھّی کھول دی۔

"جب تک میں چلا نہ جاؤں، دیکھئے مت!"

اُس نے میری ہتھیلی پر کچھ رکھ دیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ جس میں ذرا ذرا سے جمے ہوئے پھل تھے۔

دوسرا دن اُس نے ہمارے ساتھ ہی گزارا۔ اگلے روز علی الصبح اسے جانا تھا اس لیے شام کو رخصت ہونے لگا۔ امّی اور ابّا سہ پہر سے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ پیغام ابّا نے دیئے ہوں گے اور کچھ امّی نے۔

اور ہاں کچھ دیر کے لیے وُہ حامد سے بھی ملنے گیا جس سے وُہ بڑے تپاک سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ کل ہی ابّا سے کہلوا دوں گی کہ اُنہیں صاف جواب دے دیں۔

کافی رات جا چکی تھی۔ وُہ جانے کے لیے بار بار اُٹھتا تھا مگر اسے کچھ دیر کیلئے اور ٹھہرا لیتے تھے۔ میں چاہتی تھی اس سے علیحدگی میں بھی باتیں ہُوں۔ وہاں تو اُس نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں اس سے لاہور میں ملتی رہا کروں۔

چلتے وقت اس نے بچّوں کو پیار کیا۔ امّی نے اس کی پیشانی چُوم لی۔ ابّا نے اُسے تھپتھپایا۔۔۔ جیسے کسی کو شاباش دے رہے ہوں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ وُہ شکارے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر سب کے سب باہر کھڑے رہے۔ پھر اندر چلے آئے۔ میں اکیلی بر آمد کے ستون سے لگی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کشتی جھیل کے وسط میں پہنچ کر پھر واپس ہو گئی۔

میں حیران رہ گئی۔ کشتی آ کر بالکل میرے سامنے رُکی۔

وُہ آہستہ سے بولا۔ ”میں ہیٹ لے کر ابھی آیا۔ تم ذرا یہیں ٹھہرو“

وُہ جان بوجھ کر ہیٹ چھوڑ گیا تھا۔ چالاک کہیں کا۔

میں بھی اس کے ساتھ کمرے میں گئی۔۔۔ اس نے ہیٹ اُٹھایا اور بولا۔

”میں نے سوچا آپ سے علیحدہ مِل آؤں۔“

”شکریہ!“

”آپ مجھ سے لاہور میں ضرور ملا کریں گی؟“

مَیں نے اثبات کے طور پر سر ہلا دیا۔

”اچھا خدا حافظ!“ اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

میں چُپ تھی۔

"اس میں بسورنے کی بات کونسی ہے؟ بھئی ہنسونا!"

"خدا حافظ!" میں نے گھُٹی ہُوئی آواز سے کہا۔

"ارے میرا رومال کہاں گیا؟"

اس کا رومال تو میرے چرمی بیگ میں محفوظ تھا۔

"یہ لے لیجئے!" میں نے اپنا رومال اُس کی جیب میں لگا دیا۔

"افّوہ! ایک بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔" اُس نے سُلگتے ہوئے سگریٹ کا ایک خوب لمبا کش لیا۔ میں نے دونوں ہاتھ مُنہ پر ڈھانپ لئے۔

"نہیں نہیں!" میں نے مُنہ چھپاتے ہوئے کہا۔

اُس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر زبردستی دُھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا۔

"اچھا۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

جاتے ہوئے اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر ہیٹ سے مجھے جھُک کر سلام کیا۔ میں نے بھی مُسکرا کر جواب دیا۔

وُہ کشتی میں اُس پار جار ہا تھا۔ میں ستون سے لگی اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے دل میں اُمنگیں ناچ رہی تھیں۔

جھیل کے شفاف پانی پر چاند کی کرنیں رقصاں تھیں۔

چُپ!۔۔۔ چُپ!!۔۔۔ چُپ!!!

تیزی سے کشتی کے چپوؤں کی آواز آرہی تھی، بالکل میرے دل کی دھڑکن سے ملتی جلتی۔

مجھے جھیل کبھی اس قدر پیاری نہیں لگی تھی۔ چاندنی کبھی اتنی حسین نہیں دکھائی دی تھی۔ دُور کوئی کشمیری ملّاح مست آواز میں گارہا تھا۔ کسی چیز میں بھی سکون نہیں تھا۔۔۔۔ پہاڑوں کی اوٹ میں بھورے بھورے بادلوں میں بجلی تڑپ رہی تھی۔ پانی کی لہریں مستانہ وار جھوم رہی تھیں۔ سفیدے کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ صاف سُنائی دے رہی تھی۔۔۔۔ آسمان پر تارے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔۔۔۔ ہر ایک چیز میں زندگی تھی، تڑپ تھی۔۔۔۔ میرے سامنے کائنات رقص کررہی تھی۔۔۔۔

میں مُسکرائی۔۔۔۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی جواری اپناسب کچھ لٹاکر مُسکرادیتا ہو۔ میں سب کچھ ہار بیٹھی تھی۔۔۔ مگر یہ شکست کتنی دل فریب تھی؟

# فاسٹ باؤلر

فاسٹ کا مطلب ہے تیز اور باؤلر کا مطلب ہے گیند پھینکنے والا۔ بس سمجھ لیجئے کہ ان دونوں کا مطلب ہُوا۔ تیز گیند پھینکنے والا۔ فاسٹ باؤلر وُہ انسان ہے جو وکٹوں سے بیس پچیس قدم دور سے ہی یکلخت دوڑنا شروع کر دیتا ہے اور وکٹوں کے پاس آ کر اس کی حالت قابلِ رحم اور صورت قابلِ دید ہو جاتی ہے۔ وُہ پانچ چھ قدم پرے سے ہی ایک لمبی چھلانگ لگاتا ہے اور بے تحاشا گھما کر گیند کو کھلاڑی کے مُنہ پر دے مارتا ہے اور پھر کچھ دُور تک اپنے ہی زور میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ادھر یا تو وکٹ اڑتی دکھائی دیتی ہے یا دھپ سے گیند کھلاڑی کے لگتی ہے اور یا وُہ شاندار باؤنڈری لگتی ہے کہ گیند پورے گیارہ آدمیوں کے روکنے سے بھی نہیں رُکتی۔ فاسٹ باؤلر کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی کھلاڑی اَڑ جائے اور آؤٹ ہونے کا نام نہ لے۔ دوسرے الفاظ میں کھلاڑی کو ڈرانے کی کوشش کی جاتی ہو۔ اگر گراؤنڈ میں بارش ہو گئی ہو یا تھوڑی سی بھی نمی ہو تو فاسٹ باؤلر صاحب کا ذرا سا بھی بس نہیں چلتا۔

جن دنوں کا میں یہ قصّہ بیان کرتا ہُوں۔ اُن دنوں میں بھی بد قسمتی سے اُسی طبقے میں شمار ہوتا تھا جسے فاسٹ باؤلرز کے نام سے پکارا جاتا۔

میں ایک سالانہ امتحان میں بیٹھا اور اتّفاق سے پاس ہو گیا۔ اب مجھے دوسرے شہر میں بھیجا گیا۔ رہنے کو ہوسٹل ہی میں رہتا تھا مگر مجھے ایک صاحب کی نگرانی میں رکھا گیا۔ ان کے ہم لوگوں سے بڑے پرانے تعلقات تھے۔ انہوں نے بہت سال پہلے مجھے چھوٹا سا دیکھا تھا اور اب مجھے بڑا سا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں خان صاحب کا خطاب ملا تھا۔ کوئی پچاس پچپن سال کی عمر، خُدا جھُوٹ نہ بُلوائے کم از کم اُٹھ دس عینکیں استعمال کرتے تھے۔ اور عینکیں بھی ایسی کہ ایک کے اُوپر دوسری فٹ ہو چلی جاتی تھی۔ پڑھتے وقت ایک عینک لگی ہُوئی ہے۔ کسی نے کوئی بات کی۔ انہوں نے جلدی سے دوسری عینک پہلی عینک پر لگائی اور جواب دے دیا۔ کوئی بچّہ دُور سے چلّایا۔ انہوں نے نمبر دو عینک اتار دی اور کوئی اور عینک لگائی اور اُس کی طرف دیکھ کر اُسے موقع کے مطابق دھمکایا یا چمکارا۔ کھانا کھاتے وقت کوئی اور عینک لگتی تھی۔ سینما میں کوئی اور۔

مجھے اُن کے گھر ہفتے میں کم از کم تین مرتبہ حاضری دینی پڑتی تھی اور اتوار کو صُبح موٹر میں کُنبے کے ساتھ کہیں باہر سیر سپاٹے اور شام کو سینما ساتھ جانا ہوتا تھا۔

وقت بہت اچھا کٹ جاتا تھا۔ خان صاحب اور اُن کی بیگم مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ بچّے بھی مجھ پر عاشق تھے مگر جہاں یہ سب کچھ تھا وہاں میں ایک ہستی سے بہت ڈرتا تھا۔ یہ ان کی بڑی لڑکی تسنیم تھی۔ اگر مجھ سے کچھ بڑی نہیں تو غالباً برابر عمر کی ہو گی۔

اب میرا فرض ہے کہ اس کی شکل بھی بتاؤں، سو عرض ہے کہ نہ تو اُس کی بھنویں کمان کی طرح تھیں، نہ پلکیں تیر کی طرح، نہ اُس کی گردن کئی فٹ لمبی تھی اور نہ اس کی آنکھیں سحر انگیز تھیں اور نہ ہی چار چار انچ چوڑی بھی تھیں۔ اور ہاں میں شاعر حضرات سے معافی چاہتا ہوں۔ اُس کے لب بھی تھے جن پر مجھے نہ تو کبھی مسیحائی نظر آئی اور نہ کبھی خُون دکھائی دیا۔ کئی سال پہلے میں اور وُہ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اتنی مدّت کے بعد جب میں اُن کے ہاں گیا۔ اُس نے مجھے دیکھا اور میں نے اُسے۔ اُسے دیکھ کر نہ تو میرا دل بے تحاشا دھڑکتا ہوا سینے سے باہر آیا اور نہ ہی میری روح آنکھوں میں کھینچ کر آ گئی۔ مگر وُہ مجھے اچھی ضرور لگی۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس جذبے کو شاعرانہ طریقے سے بیان کیا جائے کہ جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تو یوں معلوم ہوا کہ زہرہ زمین پر اُتر آئی ہے۔ میرا دل تھر تھرایا۔ میں ڈرا کہ کہیں تھم نہ جائے۔ میں اُس حسین شعلے کی تاب نہ لا سکا اور بھسم ہو گیا، مجھے یکلخت محسوس ہوا کہ میرا دل غائب ہو

چکا ہے۔ صرف شریانیں باقی رہ گئی ہیں۔ جگر میں کسی نے دیا سلائی سی دکھا دی ہے۔ پھیپھڑے زخمی ہو چکے ہیں۔ گُردوں نے اپنا کام چھوڑ کر ہڑتال شروع کر دی ہے وغیرہ وغیرہ۔

وُہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ اپنی جماعت میں بڑی لائق تھی۔ ویسے بھی اس میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ مگر سب سے بڑی برائی یہ تھی کہ وُہ مجھے ہر وقت چھیڑتی رہتی تھی۔ اس قدر تنگ کرتی کہ میں بسورنے لگتا۔ اس طریقے سے ستاتی کہ اس کی باتیں صرف مجھے ہی چبھتیں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے۔ میں کوئی دلچسپ بات سناتا۔ جب میں بات ختم کرنے لگتا تو وُہ مُسکرا کر کہتی۔ ''اچھا! بس یہی بات تھی؟'' یا ''اُفّوہ! اب پتہ چلا ہمیں خوب!'' آپ خود ہی خیال فرمائیے کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کس قدر کوفت ہوتی آپ کو۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کسی میچ کا کارنامہ سُنا رہا ہوں۔ کچھ سچ ہے کچھ جھوٹ۔ خان صاحب غور سے سُن رہے ہیں۔ میں سینہ پھُلا کر کہتا ہوں۔ ''اجی مجھے انہوں نے بالکل آخر میں بھیجا اور ابھی پچاس رنز باقی تھیں۔ ہار سامنے نظر آرہی تھی۔ میں نے پہلے تو گیندیں روکیں۔ باؤلرز کو تھکا دیا اور پھر جو ہٹیں لگانی شروع کی ہیں تو بس!''

"اتنے میں آنکھ کھل گئی!" وُہ بولی، خان صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا جس میں ان کی بہت سی عینکیں ناک سے پھسل گئیں۔ کُنبے کا کُنبہ ہنسنے لگا اور میں کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ جب میں کوئی عقل مندی کی بات شروع کرتا تو وُہ میرے بچپن کے واقعات دہراتی اور میری بات فوراً ہنسی میں اُڑ جاتی۔ غرضیکہ میں اس لڑکی سے تنگ آ گیا تھا۔ آخر سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ بس اب ان کے گھر آنا جانا بند کر دیا جائے۔ ابھی چار روز ہی اس طرح گزرے ہوں گے کہ پانچویں روز خاں صاحب مع کار کے ہوسٹل میں آئے اور مجھے لے گئے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میچ کھیل کر واپس آیا۔ دیر کافی ہو چکی تھی اور خان صاحب کے ہاں حاضری بھی دینی تھی۔ بغیر کپڑے تبدیل کئے چلا گیا۔ وُہ بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر جھٹ عینک بدلی اور بولے:

"آؤ بیٹا! تمہارے بارے ہی میں سوچ ساچ رہا تھا میں۔ اور تسنیم بھی تمہارا انتظار انتظور کر رہی تھی۔"

میں نے سلام کیا اور قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے جلدی سے عینک بدلی اور بولے۔

"آج تم کچھ دُبلے دُبلے سے دکھائی دیتے ہو!"

"کیا سچ مچ دُبلا دکھائی دیتا ہوں؟ بھلا دو روز میں کسی طرح دُبلا ہو گیا ہوں؟۔"
میں نے اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تھکا ہوا ضرور ہوں۔ صُبح سے میچ کھیلتا رہا۔ سارا دن بھاگنا پڑا ہے۔"

"اور ہاں ایک بات تو میں بالکل بھول گیا تھا۔ وُہ یہ کہ اس میچ مُوچ سے فائدہ کیا ہے آخر؟ صُبح سے شام تک بھاگتے رہتے ہو۔ اور سچ پوچھو تو مجھے یہ کرکٹ ورکٹ پسند ہی نہیں۔ ایک آدمی کھیل رہا ہے اور دوسری طرف کے گیارہ کے گیارہ آدمیوں کا دل بے ایمان ہے۔ دل میں دعائیں مانگ رہے ہیں کہ یہ کم بخت کہیں آوٹ واؤٹ ہو تو گھر چلیں۔"

"جی بُرا تو مجھے بھی لگتا ہے۔" میں نے اُوپرے دل سے کہا۔ "مگر کیا کروں۔ اب ایک دفعہ شروع کر دیا ہے تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اچھا تو گویا یہ بھی شراب شروب ہُوئی کہ کم بخت چھٹتی ہی نہیں۔ کیوں؟"
انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم کھیلتے کھولتے کیسے ہو؟"

"اجی کیا خاک کھیلتا ہوں۔ بس گیند پھینکتا ہوں۔"

"کیا باؤلر ہوئے تم؟ ایں؟"

"جی ہاں! فاسٹ باؤلر!!" میں نے ذرا رعب سے کہا۔

"تو میاں تمہارا میچ ضرور دیکھیں گے کبھی۔ مگر ذرا اسٹائل سٹوئل تو دکھاؤ اپنا۔"

"تو کیا یہیں کمرے میں دکھاؤں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دیکھیں تو سہی تم کیسے گیند وید پھینکتے ہو؟" انہوں نے جلدی سے دوسری عینک بدل لی۔

میں ہنستا ہوا اٹھا اور دروازے تک قدم گنتا ہوا گیا۔

"دیکھئے جی! فرض کیا کہ یہ گیند ہے۔" میں نے ان کی دیا سلائی کے بکس کو ہاتھ میں لے کر کہا۔

"ویسے تو میں بہت دور سے بھاگ کر آیا کرتا ہوں مگر وکٹوں کے پاس آ کر گیند۔۔۔ اس طرح۔۔۔ پھینکتا ہوں۔"

میں نے ہاتھ گھمایا اور بکس کو دوسرے دروازے پر دے مارا۔

"بہت خوب" یہ آواز تسنیم کی تھی۔ میرے دیوتا کوچ کر گئے۔

"دیکھا ابّا جان آپ نے! اس کا نام ہے باؤلنگ!" وُہ پردہ اٹھا کر داخل ہُوئی۔ میں وہیں کھڑا کا کھڑا ہو گیا۔ لاحول ولا قوۃ! گویا یہ ایک ہفتے کی چھیڑ خانی میں نے خود ہی مول لے لی تھی۔ اگلے روز میرا نام فاسٹ باؤلر رکھ دیا گیا۔ گھر میں بچّوں سے بھی کہہ دیا گیا وُہ مجھے بھائی جان کی بجائے فاسٹ باؤلر کہا کریں۔ گھر کے طوطے کو پورے ایک ہفتے کی محنت کے بعد فاسٹ باؤلر خوش آمدید سکھایا گیا۔ میری جتنی کتابیں ان کے ہاں پڑی تھیں اس سب پر فاسٹ باؤلر لکھ دیا گیا۔

اگلے ہفتے ہمارا کسی دوسرے کالج سے میچ تھا۔ میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی مگر خاں صاحب اپنی بات پر اڑے رہے کہ میچ میں وُہ بھی آئیں گے اور تسنیم بھی ضرور آئے گی۔ میں نے بہت سے دلائل پیش کئے۔

"بھلا لڑکیاں بھی کبھی کرکٹ میچ میں آئی ہیں؟"

"جس چیز میں دلچسپی نہیں اُس کے دیکھنے کا فائدہ؟"

"ان کا امتحان نزدیک ہے۔ کیا ضروری ہے، خواہ مخواہ ایک دن ضائع کرنا۔"

جس پر جواب ملا۔ ہم دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے۔ خواہ آپ کھیلیں یا نہ کھیلیں۔ آپ میچ میں کتنی ہی فاسٹ باؤلنگ کیوں نہ کریں آپ کو ایک وکٹ بھی نہیں ملے گی۔ آپ خود ہی خیال فرمایئے بھلا میں کیا جواب دیتا۔

خیر! میچ والا دن آیا۔ میں دُعا مانگ رہا تھا کہ ہمارے شروع کے کھلاڑی ذرا جم جائیں اور دوپہر تک کھیلتے رہیں۔ خان صاحب وغیرہ آئیں گے اُن کا کھیل دیکھ کر چلے جائیں گے۔ نہ میرے کھیل کی باری آئے گی اور نہ بولنگ کی۔ مگر سارا کام اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ شروع کے کھلاڑی بہت جلد رحلت فرما گئے۔ اب ہم آخر کے اناڑی رہ گئے۔ مجھے انہوں نے نویں نمبر پر بھیجا۔ میں نے اچھی طرح چاروں طرف دیکھا۔ خان صاحب کی کار کا نام و نشان تک بھی نہ تھا۔ میں نے کھیلنا شروع کیا۔ گیندیں روکتا رہا۔ روکے گیا۔ کھیل کا رنگ ہی بدل گیا۔ آہستہ آہستہ رنز بھی ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں نے مل کر سکور ساٹھ سے سو تک پہنچا دیا۔ لوگ ہر ایک ہٹ پر شور مچاتے تھے۔ ہمارے کالج کے لڑکے مارے خوشی کے ناچ رہے تھے۔ یکایک میری نگاہ خان صاحب کی کار پر پڑی جو سامنے آ رہی تھی۔ انہوں نے کار کو دُور ہی ٹھہرا لیا اور لگے جھانکنے۔ غالباً عینک ضرور بدلی ہو گی۔ پچھلی سیٹ پر کھڑکی میں سے کچھ نیلی نیلی چیز نظر آ رہی تھی۔ یہ تسنیم تھی۔

میں بوکھلا سا گیا۔ پہلے ہی یقین تھا کہ ان لوگوں کے سامنے کھیل نہ سکوں گا۔ کیا تو میں بڑھ بڑھ کر ہٹّیں لگا رہا تھا اور کیا ایک دم گیندیں روکنا شروع کر دیں۔ دو گیندیں ہی روکی تھیں کہ تیسری زنّاٹے سے آئی۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، وکٹ غائب! لاحول ولا قوۃ! مجھے جس بات کا ڈر تھا وہی ہو کر رہی۔ میرے آؤٹ

ہونے سے دوسرے ساتھی کی ہمت کچھ ٹوٹ سی گئی۔ گیارہویں صاحب نے جاتے ہی بلّا گھمایا اور خودکُشی فرمالی۔ یعنی خود ہی بلّا وکٹوں میں مار لیا۔ گویا باؤلر سے یہ کہا کہ بھیّا تو کیوں ناراض ہوتا ہے ہم تو خود ہی چلے جاتے ہیں۔

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

گیارہویں حضرت بھی سستے ہی میں چھوٹ گئے۔

اب ان کی باری تھی۔ ہمارے کپتان نے میرے ہاتھ میں نئی گیند دی اور کہا۔ ”مولانا! اب ہماری جیت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ آج پورا زور لگا دو۔“

میں نے کار کی طرف دیکھا۔ ایک جھرجھری سی آگئی۔ دل میں خیال آیا کہ اگر یہ کار یونہی نظر آتی رہی تو آج کچھ بھی نہ ہوسکے گا اور سارا کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ میچ شروع ہوا۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ میں نے آیۃ الکرسی پڑھی، پھر ایک گلاس پانی پیا۔ دل کو تسلی دی اور وکٹوں سے قدم گن کر فاصلہ ناپا۔۔ بولنگ شروع کی۔ وکٹوں کے پاس آکر قدم غلط ہوگئے اور ایک عجیب و غریب ٹائل سے گیند پھینکی جو کھلاڑی کے تین فٹ ادھر سے نکل گئی۔ ”وائڈ بال!“ ایمپائر چلّایا اور لوگوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ ”بہت اچھے۔ شاباش ایسے ہی گیند پھینکو!“

”ارے واہ رے میرے شیر! کیا گیند پھینکی ہے۔ نثار کو مات کر دیا ہے اس وقت تو!“

خیر! دوسری گیند ذرا ٹھیک پڑی۔ مگر اس پر کھلاڑی نے وُہ زنّاٹے دار ہٹ لگائی ہے کہ گیند درختوں کے اُوپر سے گزر گئی۔ ایک شاندار چھکّا۔۔۔(SIXER) پڑا۔ لوگوں نے یہ شور مچایا کہ خدا کی پناہ! تیری گیند پھینکتے پھینکتے میں وکٹوں کے پاس آکر رک گیا۔ چوتھی پر میرا پاؤں پھسل گیا اور گیند کھلاڑی کے سر کے اُوپر سے گزر گئی۔ غرضیکہ میرے دو اووروں میں سکور تیس ہو گیا۔ کار بدستور کھڑی تھی۔ تیسرے اوور میں میں نے پہلی گیند ذرا آہستہ پھینکی۔ کھلاڑی اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ گیند سیدھی وکٹوں میں گئی۔ میدان تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اُن کا کپتان آؤٹ ہو گیا تھا۔ میں نے فاتحانہ نگاہوں سے کار کی جانب دیکھا مگر کار غائب تھی۔ وُہ لوگ پہلے ہی چلے گئے تھے۔ ایسا دِل چاہا خودکشی کر لوں۔

اب جو جھنجھلا کر میں نے باؤلنگ شروع کی ہے تو وکٹوں کا تانتا بندھ گیا۔ دوسرا تیرا چوتھا۔ غرضیکہ ساری ٹیم پچاس رنز میں آوٹ! ہم جیت گئے تھے۔ سات وکٹیں میری تھیں۔ مگر ہی سب کچھ فضول تھا۔ اسی افسوس میں اس روز میں اُن کے یہاں نہیں گیا۔ دوسرے روز اتوار تھا۔ ڈرتے ڈرتے پہنچا۔ سارا کُنبہ بیٹھا

ریڈیو سُن رہا تھا۔ خاں صاحب دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "ارے تم صبح کیوں نہیں آئے۔ آج! ہم تمہاری وجہ سے کہیں سیر پر بھی نہیں گئے۔"

"افّوہ! مجھے بڑا افسوس ہے۔ آپ چلے جاتے۔ میرا انتظار ناحق کیا آپ نے۔" میں نے بدستور سر جھکائے رکھا۔

"جب تک کوئی فاسٹ باؤلر ساتھ نہ ہو تب تک سیر کا کیا لطف آسکتا ہے۔ کیوں ابّا۔" تسنیم بولی۔

"تم کچھ رنجیدہ رنجودہ سے معلوم ہوتے ہو۔ کیا ہوا جو ایک میچ میں وکٹیں نہ ملیں۔ میں تو پھر یہی کہوں گا کہ یہ کرکٹ ورکٹ فضول ہے بالکل۔"

جی میں آیا کہ کہہ دوں۔ "جناب سات وکٹیں لی ہیں سات۔" مگر پھر تسنیم کا ڈر لگا کہ سمجھے گی جھوٹ بول رہا ہے اور دُگنا مذاق اُڑے گا۔

"ہاں! کیا ہوا جو کھلاڑی آؤٹ نہیں ہوئے۔ یہ ان کا قصور تھا۔ ویسے آپ کا اسٹائل تو ماشاء اللہ نہایت ہی لاجواب تھا۔" وُہ بولی۔

"بس اب چپ بھی کر، خواہ مخواہ ستا رہی ہے، بھولے بھالے بچّے کو۔" اس کی والدہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بہت یاد آیا ابّا جان! آج آسٹریلیا اور انگلینڈ کے کرکٹ میچ کو نشر کیا جارہا ہے۔ اگر فرمائیں تو بدلوں اسٹیشن۔"

یہ کہہ کر خود ہی اسٹیشن بدل دیا۔ آواز آئی۔ "ابھی ابھی کچھ بارش سی ہُوئی تھی۔ جس سے زمین گیلی ہے اور ریلی اور وریٹی سے لوگوں کو بہت کچھ اُمّیدیں ہیں۔ مگر دونوں ٹیموں کے فاسٹ باؤلر آج کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" فاسٹ باؤلر کا نام آتے ہی سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ سب کے چہروں پر مُسکراہٹ آگئی۔ ایک بچّہ تو کُھس پُھس اور ہی ہی کی حد سے باہر نکل گیا اور کھِلکھِلا کر ہنس پڑا۔ غصّے سے میرا مُنہ سُرخ ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت میں نے اپنا مُنہ آئینے میں نہیں دیکھا مگر مجھے یقین ہے کہ ضرور سُرخ ہو گیا ہو گا۔ میں اُٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ اس نے جلدی سے ریڈیو بند کر دیا۔ "آپ بُرا مان گئے؟ لو بھئی خبردار! جو آئندہ کسی نے کبھی انہیں فاسٹ باؤلر کہا ہے تو۔"

خان صاحب نے جلدی سے عینک بدلی اور بولے۔ "بس تسنیم! اب تم اپنے کمرے میں جا کر کپڑے بدلو سینما میں دیر ہو رہی ہے۔ وُہ چلی گئی۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ تم اس کے کہنے کا ذرا بھی خیال نہ کیا کرو۔ دوپہر سے تمہارا انتظار کرتی رہتی ہے۔ گھڑی گھڑی دروازے تک جاتی ہے۔ کئی دفعہ

شوفر سے کہتی ہے کہ تمہیں لے آئے اور پھر جب تم آجاتے ہو تو تمہیں چھیڑتی ہے۔ عجیب لڑکی ہے۔"

"ہاں عجیب لڑکی ہے؟" میں نے دل میں دہرایا۔

ہم لوگ سینما ذرا دیر سے پہنچے، نیوز دکھائی جا رہی تھیں۔ بد قسمتی سے وہاں بھی کسی کرکٹ میچ کا قضیہ تھا۔ انگلینڈ کے فاسٹ باؤلر فارنز کو گیند پھینکتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ آواز آئی۔

"یہ ہیں مسٹر فائنرز جو زمانہ حاضر کے بہترین فاسٹ باؤلر ہیں۔" میں چوکنّا سا ہو گیا اور کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی ہنس تو نہیں ہو رہا۔ پچھلی قطار سے تسنیم نے آگے سر نکال کر میرے کان کے قریب کہا۔ "دیکھئے میں نہیں ہنس رہی ہوں، پھر بھی آپ کہہ دیں۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ خان صاحب نے جلدی سے عینک بدلی اور میری طرف دیکھ کر بولے۔ "یہ تُم کہاں جا رہے ہو؟۔"

"ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہاں سے جو دوڑا ہُوں تو ہوسٹل پہنچ کر دم لیا۔ ساری رات مجھے نیند نہ آئی۔ آخر اس لڑکی کا مطلب کیا ہے؟ اسے مجھ سے نفرت ہے کیا؟ مجھے چھیڑتی ہے۔ دوسروں کے سامنے شرمندہ کرکے خوش ہوتی ہے۔ جانتی ہے

کہ فاسٹ باؤلر کے نام سے میں چِڑتا ہوں۔ پھر بھی جان بوجھ کر بار بار یہی دُہراتی ہے۔ محض اس لیے کہ میں کڑھوں۔ مگر پھر یہ میرا انتظار بھی کرتی ہے۔ آخر کیا معمّہ ہے یہ؟ میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ کل کہہ دوں گا۔ دیکھئے صاحب! بچّہ میں نہیں جس سے آپ کھیلتی رہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں بےوقوف بھی نہیں ہوں۔ اس لیے آپ مجھے بخش دیں۔ ورنہ میں آپ کے ہاں آنا جانا بند کر دوں گا۔ مگر پھر مجھے ہنسی بھی آئی، لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی بات ہُوئی۔ ایک لڑکی سے اس قسم کی باتیں کہوں گا اور پھر ایک ایسی لڑکی سے جو اتنی پیاری ہے۔ نیلے لباس میں تو سچ مچ گڑیا سی معلوم ہوتی ہے۔ کتنی بھولی بھالی سی دکھائی دیتی ہے اور جب چھیڑتی ہے تو کیا شرارت انگیز تبسّم لبوں پر ہوتا ہے۔ مجھے غصّہ ضرور آتا ہے مگر اُس میں پیار بھی ہوتا ہے۔ اگر کئی روز ان کے گھر نہ جاؤں تب اداس سا ہو جاتا ہوں۔ پھر دل میں گُدگُدی سی اُٹھتی ہے کہ کوئی چھیڑے۔ کوئی فاسٹ باؤلر کہے۔ اُسے ضرور میرا کچھ خیال ہے۔ تبھی تو وُہ انتظار کرتی رہتی ہے مگر۔۔۔ یہ بعض اوقات اجنبیوں کی سی باتیں۔۔۔ کیا مطلب ہے ان کا؟ واقعی وُہ عجیب لڑکی ہے، خیر صاحب! کچھ بھی ہو، اب اُن کے گھر نہیں جاؤں گا، بابا اپنی عزّت اپنے ہاتھ، جہاں بچّے سے بوڑھے تک سب مجھ پر ہنستے

ہیں اور اِدھر میں ہوں کہ ہر تیسرے روز بڑے اطمینان سے وہاں پہنچ جاتا ہوں۔۔۔مجھے پتہ نہیں میں کب سو گیا۔

ایک ہفتے تک میں اُن کے یہاں نہیں گیا۔ خان صاحب بھی آئے۔ شوفر بھی بار بار موٹر لے کر آیا۔ مگر میں پہلے تو مصروفیت کا بہانہ پیش کرتا رہا اور پھر شام کو ہوسٹل سے ہی غائب رہنے لگا۔

ایک روز علی الصبح نہا کر کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دیکھا ایک چھوٹا سا لڑکا کھڑا تھا۔ ”کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا تیس نمبر کمرہ یہی ہے نا؟“

”ہاں یہی ہے!“

”اور ایک چھ فٹ کے گورے سے لڑکے آپ ہی ہیں نا؟“

”کیا مطلب؟“

”اجی تیس نمبر کمرے میں ایک لمبے سے گورے سے مضبوط سے۔۔۔“

”کیا بے ہودہ بکواس ہے؟ آخر کیا نام ہے اُس لمبے لڑکے کا؟“

"اجی نام تو مجھے معلوم نہیں، اتا پتا میں نے بتا ہی دیا ہے۔ انہیں باہر کوئی صاحب بُلا رہے ہیں۔"

"اس میں تیرا نقصان کیا ہے ذرا پھر سے یاد کر کے بتا۔ دیکھ نہ بھیّا اچھّا ہے تو۔" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

وُہ آہستہ سے دروازے سے نکلا اور یکلخت بھاگ پڑا۔ پھر پیچھے مُڑ کر بولا۔ "فاسٹ باؤلر۔۔۔" میں اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا اور سڑک تک بھاگتا ہوا چلا گیا۔ ہوسٹل کے دروازے پر خاں صاحب کی کار کھڑی تھی۔ وُہ دوڑ کر اس میں گھُس گیا۔ کھڑکی میں سے ایک سفید سی کلائی اور نازک بازو نکلا اور مجھے اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا۔ یہ تسنیم تھی۔ "سنیے تو ذرا۔" میں نے اپنے اُوپر نگاہ ڈالی۔ ماشاء اللہ کا حلیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹائی دوسرے میں کالر کا بٹن۔ گریبان کھُلا ہُوا، بال بکھرے ہوئے۔

"ذرا اِدھر تو آیئے!" میں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

"آپ اتنے روز سے آئے کیوں نہیں؟"

میں چُپ رہا۔

"بتایئے نا! دیکھئے ہم لوگ بہت اداس رہے، ارے یہ خون سا کہاں سے آ گیا آپ کے چہرے پر؟ اس نے اپنے ننھے سے رومال کو میرے گال پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"ابھی حجامت کی تھی میں نے۔"

"حجامت کی تھی؟ کس کی؟"

"اپنی!۔۔۔اور کس کی؟" میں ہنس پڑا۔ وُہ بھی ہنس پڑی۔

"تو آج آئیں گے نا آپ؟"

"جی نہیں! میں نہیں آنے گا۔"

"جی نہیں! ضرور آئیں گے آپ!" اُس نے بالکل میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "میں کالج جارہی ہُوں، چلیں گے آپ؟"

"کیا آپ کے کالج چلوں؟"

"جی نہیں! چلئے آپ کے کالج میں چھوڑتی جاؤں آپ کو۔"

"مگر میرا حلیہ تو ملاحظہ ہو ذرا۔" کار چل دی۔ اس نے رومال ہلایا میں نے ٹائی ہلا دی۔

میں پھر پہلے کی طرح آنے جانے لگا، مگر جلد ہی ایک عجیب سا واقعہ پیش آ گیا جس نے مجھ پر اثر ڈالا۔

بات یوں تھی کہ خان صاحب کے ہاں اکثر سینما بہت فری پاس آیا کرتے تھے۔ یُوں تو میں ہر اتوار کو اُن کے ساتھ سینما جایا کرتا تھا مگر دوسرے تیسرے روز ان کے ہاں سے فری پاس بھی اکٹھے کر لاتا تھا۔ یار دوست بھی خوب ہل گئے تھے۔ ہر روز اُن کا یہی تقاضا رہتا تھا کہ "پاس لاؤ۔" ایک بہت اچھی پکچر لگی ہُوئی تھی۔ مجھ پر بڑا دباؤ ڈالا گیا کہ پاس لاؤں۔ میں خاں صاحب کے ہاں پہنچا تو وُہ باہر گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر باغ میں سے گزر رہا تھا کہ تسنیم نظر آئی۔ یہ گلاب کے قلعے میں کُرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ گلابی ساڑی پہن رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وُہ بھی گلاب کا پھُول ہو۔ اُس نے مجھے روک لیا۔ اتنی جلدی واپس کیوں جا رہے ہیں آپ؟" یہ کہہ کر اس نے ایک پھُول ہاتھ میں لے کر گھمایا اور پھُول ایسے پھینکا جیسے بولنگ کرتے ہیں۔

"ایک کام تھا خان صاحب سے!" میں بولا۔

"بہت اچھا! جاسکتے ہیں آپ؟" میں حیران رہ گیا۔ کیا یہ بد تمیزی تھی، اس طرح بھی کوئی باتیں کرتا ہے۔ میں نے سائیکل سنبھالی۔ پھر خیال آیا کہ اگر پاس نہ لے گیا تو وُہ جو چار پانچ حضرات انتظار کر رہے ہیں۔ وُہ کیا کہیں گے۔

"دیکھئے! ذرا مجھے پاس لا دیجئے!"

"ہمیں پاس واس کا کچھ پتہ نہیں کہاں پڑا ہے کہاں نہیں، آپ زیادہ سینما نہ دیکھا کیجئے سمجھے، دن بھر آپ بولنگ کرتے رہتے ہیں۔ رات کو پڑھا کیجئے۔ سمجھ گئے آپ! اور پھر بڑوں کا کہنا ضرور ماننا چاہئے چھوٹوں کو۔"

"افّوہ! تو گویا بڑی ہیں آپ، لاحول ولا قوۃ!۔"

"کیوں اس میں لاحول ولا قوۃ کی کیا بات ہے؟ سچ کہتی ہوں۔"

"خیر غور کیا جائے گا اس پر! کل سے پڑھا کریں گے۔ ذرا پاس تو لا دیجئے۔"

"آج ابا جان بھی سینما جانے کو کہہ رہے تھے۔ اُنہوں نے پوچھا۔ پاس کہاں ہیں تو پھر؟"

"مگر ان سے تو سینما میں کوئی پاس نہیں مانگے گا، دیکھئے لا دیجئے!"

"بہت اچھا مگر۔۔۔!" وُہ ہنس پڑی۔۔۔ اور اندر سے پاس اُٹھالائی، میں پاس لے کر چل دیا۔ میں نے سائیکل چلائی ہی تھی کہ خان صاحب کی کار کوٹھی میں داخل ہُوئی۔ انہوں نے مجھے جھٹ روک لیا۔

"چائے وائے پی کر جانا بھئی!" وُہ بولے۔ میں نے جلدی سے ایک پیالی پی اور اُٹھا ہی تھی کہ تسنیم بولی۔

"ابّا جان! نہ معلوم یہ آپ کے سینما کے پاس کون چرا کر لے جاتا ہے ہر روز؟"

"لے جاتا ہو گا کوئی کمبخت!" خان صاحب بولے۔ "اور میں کون سا روز کھیل ویل دیکھتا ہوں۔"

"مگر اب سوچیئے تو سہی، آج کسی نے پاس چرایا ہے تو کل دوسری چیز چرا لے گا۔"

اُدھر میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا مگر کیا مجال جو اس پر ذرا سا بھی اثر ہوا ہو۔

"تو پھر کیا کیا جائے اب؟" خان صاحب جھنجلا کر بولے۔

"اجی بندوبست ہونا چاہیئے اس چوری کا۔ آپ آج خود جا کر چور کو پکڑ لیجیئے۔"

"دیکھا تم نے! یہ لڑکی کیسی جاہلوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ بھلا اب میں ایک پاس کی خاطر سینما کا پہرہ وہرہ دوں گا۔"

"نہیں ابّا! آج ضرور چور کا پتہ نکالئے! وُہ ضرور آپ کے پاس لے کر سینما آئے گا۔"

"اچھا تو جناب! مجھے اجازت دیجئے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ وہاں سے سیدھا ہوسٹل پہنچا دوستوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ بھیّا پاس چُرا کر لایا ہُوں۔ اگر پتہ چل گیا تو وہاں سے فوراً نکال دیئے جائیں گے مگر وُہ نہ مانے۔ خیر سینما پہنچے۔ انہیں میں نے اندر بھیج دیا اور خود بڑی شان سے باہر ٹہلنے لگا۔ سامنے سے مینجر سگریٹ پیتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ "معاف کیجئے، کیا میں پُوچھ سکتا ہوں کہ خان صاحب آپ کے کیا لگتے ہیں؟"

"میرے وُہ یعنی میں اُن کا۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وُہ میرے ایک عزیز ہیں۔"

"جی ہاں! اور یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وُہ آپ کے کون ہوتے ہیں؟"

"جی! جی وُہ میرے۔۔۔ میرے چچا ہیں"

"اچھا تو آپ ٹھہریئے میں ذرا فون تک ہو آؤں، ابھی آیا۔۔" غالباً وُہ خان صاحب سے پوچھنے گیا تھا کہ ان کا کوئی بھتیجا بھی ہے یا نہیں۔ مگر بد قسمتی سے اُن کا کوئی بھتیجا تو کیا کوئی بھانجا تک بھی نہیں تھا۔

میں لپک کر اندر پہنچا اور ان حضرات سے کہہ دیا کہ بھانڈا پھُوٹ گیا ہے، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ منیجر کم بخت میرے پیچھے لگا ہے۔ اب میں دوڑتا ہوں۔ اتنے میں پکچر شروع ہو گئی۔

گیٹ سے منیجر کی آواز آئی۔ خاں صاحب نے کہا "جو پاس لایا ہے اُسے پکڑ لو۔ ارے وہی لمبا سا لڑکا تو ہے جس سے ابھی باتیں کر رہا تھا۔ ابھی ابھی اندر گیا ہے وُہ ذرا پکڑو تو سہی اُسے۔"

دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ میں جھکتا ہوا دوسری طرف چلا۔

"بیٹھ جایئے؟" پچھلی قطار سے آواز آئی۔

"وُہ جا رہا ہے!" منیجر چلایا۔ میں نے قلانچ بھری اور کئی آدمیوں کے اُوپر سے ہائی جمپ کرتا ہوا سیکنڈ کلاس میں جا پہنچا۔

"لینا پکڑنا! وُہ جارہا ہے؟" سینما میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ گیٹ پر ایک خوانچے والا کھڑا تھا۔ میں نے اسے تو گیٹ کیپر کی طرف دھکیلا اور خود دروازہ کھول کر باہر دوڑا۔ میرے پیچھے اُٹھ دس آدمی بھاگے آرہے تھے۔ میں بھی بھاگ گیا۔ نصف میل کی دوڑ کا لطف آرہا تھا۔ بھلا میں اُن لوگوں کے کہاں ہاتھ آنے نے والا تھا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ تعاقب کرنے والے صرف دو تین آدمی رہ گئے تھے۔

آخر انہوں نے مجھے آہی لیا۔

"ہمیں بڑا افسوس ہے! مگر ہم مجبور ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ ذرا خان صاحب کی کوٹھی تک چلئے۔" منیجر بولا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

آگے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خان صاحب نے منیجر کو خوب ڈانٹا۔ مجھ سے سب نے معافی مانگی سوائے تسنیم کے جو اس ساری شرارت کی بانی تھی۔

میں ہوسٹل پہنچا اور باہر دیوار کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹے تک کھڑا رہا۔ جب سب لڑکے سو گئے تب اندر گیا۔ رات کو بالکل نہ سو سکا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ میں کتنا زبردست بیوقوف تھا۔ میں اب تک یہی سمجھتا رہا کہ اسے مجھ سے محبّت ہے، مگر وُہ اتنے دنوں تک مجھ سے کھیلتی رہی۔ کیا میں اتنا گیا گزرا تھا کہ میرے

جذبات کو اس طرح ٹھکرایا جائے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اپنی شکست پر خوب رویا، انسان بعض اوقات سوچتا کچھ رہتا ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ واقعی موپاساں نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ گہرے گہرے دوست، پیارے سے پیارے عزیز ایک دوسرے کے بارے میں بالکل تاریکی میں رہتے ہیں۔

میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور تہیّہ کر لیا کہ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اب زیادہ بے وقوف نہیں بنوں گا۔ اگر اُسے اپنے اُوپر غرور ہے تو ہوا کرے۔ مجھے بھی غرور ہے۔ اگر اُسے مجھ سے نفرت ہے تو میں بھی اس سے نفرت کر سکتا ہُوں۔

اگلے ہفتے مجھے بخار چڑھ گیا۔ کئی روز تک اکیلا ہوسٹل میں پڑا رہا۔ خان صاحب باقاعدہ دن میں دو مرتبہ دیکھنے آتے تھے اور ہر روز گھر لے جانے پر اصرار کرتے۔ آخر وُہ مجھے اپنے ہاں لے ہی گئے۔ وہاں جا کر اتنا فائدہ ضرور ہُوا کہ جی بہل گیا۔ میرے پلنگ کے گرد بچّے بیٹھے رہتے تھے۔ ایسے ایسے لوگ مزاج پُرسی کے لیے آتے تھی کہ بیماری کا غم آدھا رہ گیا۔ ہاں تسنیم بھی مجھے دیکھنے آتی تھی۔ اپنی والدہ کے ساتھ! اکیلی بھی نہیں۔

میں نفرت سے اُس سے مُنہ پھیر لیتا اور وُہ بھی ناک بھوں چڑھاتی۔ میری نبض دیکھتی اور چلی جاتی۔ دن گزرتے چلے جارہے تھے۔ کم بخت بخار تھا کہ اُترنے ہی میں نہ آتا تھا۔ ایک روز بہت بارش ہُوئی۔ شام کو موسم نہایت خوشگوار ہو گیا۔ بچّے بہت جلد سو گئے۔ خان صاحب بیگم صاحبہ کے ہمراہ کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔

میں اکیلا پڑا بخار میں تپ رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس وقت کوئی ایسی ہستی ہو جو میرے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرے۔ جو میری تکلیف میں شریک ہو۔ ایک رنجیدہ اور بے بس انسان اگر اپنا دُکھ کسی سے کہہ دے تو دُکھ آدھا رہ جاتا ہے۔ مجھے تسنیم یاد آرہی تھی، مگر اُسے میری کیا پرواہ تھی؟۔۔۔ اُس نے مجھے کس قدر ستایا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی خیال ہوتا تو مجھ سے ضرور معافی مانگتی۔ اس سے باتیں کئے پورا مہینہ گزر گیا تھا۔ میری آنکھیں پُرنَم ہو گئیں۔ میں دُنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ سب لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ اگر میں مر بھی جاؤں تو کسے غم ہو گا؟ تسنیم تو اُلٹا خوش ہو گی۔ بھلا کیوں خوش ہو گی؟۔۔۔ اس کا جواب مجھے خُود بھی معلوم نہیں تھا۔ بیماری میں انسان عجیب عجیب باتیں سوچتا ہے۔

یکایک میں نے اپنے چہرے پر ایک ملائم سے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی میرے سرہانے بیٹھ گیا ہو۔ ایک بھینی بھینی خوشبو میرے دماغ تک پہنچی۔ میں نے ایک آنکھ ذرا سی جھپکی۔ یہ تسنیم تھی۔ وہی نیلا لباس پہن رکھا تھا جسے دیکھ کر میں پاگل ہو جایا کرتا تھا۔

اُس کی اُنگلیاں میرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ میں نے اپنا مُنہ ایک طرف پھیر لیا۔ شاید یہ مجھے پھر ستانے آئی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنی بے بسی پر خوب روؤں۔ کیا وُہ مجھے تنگ کرنے آئی تھی۔

ٹپ سے ایک قطرہ میرے چہرے پر گِرا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ مجھے آنکھیں کھولنی ہی پڑیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا وُہ کبھی نہ بھُول سکوں گا۔ دو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وُہ رو رہی تھی، میرا دل پگھل گیا۔

کیا واقعی اُسے میرے دل کے درد کا احساس تھا؟ کیا واقعی اُسے میرا خیال تھا؟

دل سے آواز آئی۔ "پگلے! اب بھی نہ سمجھا تو آخر کب سمجھے گا؟ اب یہ معافی مانگ رہی ہے اور اگر تو یُونہی خاموش رہا تو ذرا سی دیر میں تجھے معافی مانگنی پڑے گی۔ میں نے اُس کے نازک سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔--------

میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر وُہ روتی رہی۔ اُس نے میرا ہاتھ اچھی طرح آنسوؤں سے تر کر دیا۔ کافی دیر تک ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے، دونوں کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ مگر خاموشی نے دل کے راز داستان کی صورت سامنے رکھ دیئے تھے۔ باہر ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ رات کے سنّاٹے میں دو دِل دھڑک رہے تھے۔

# کرنیں

جب لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میں نے ان کی کوٹھی کا دروازہ طے کیا اور اکیلی سڑک پر چل دیا تو میرے سامنے دُنیا اندھیر تھی۔ کوئی دل کو مسوس رہا تھا۔ میں گرا جا رہا تھا کسی عمیق غار میں۔ میری رُوح پر نامُرادی مسلّط تھی۔ عجیب سی ویرانی چھائی ہُوئی تھی۔ ایک گہری دُھند نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ سہ پہر کا زرد سُورج بڑی اُداسی سے چمک رہا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے مٹیالے غبار نے دُھوپ کو دھندلا کر دیا تھا۔ وُہ راستہ کتنا تنہا تھا؟ کتنا بھیانک؟ ہوا کے گرم جھونکوں سے بگولے اُٹھ رہے تھے۔ سوکھے ہوئے پتّے اُڑ رہے تھے۔

مجھے سُن کر یقین بھی تھا اور نہیں بھی، اتنی میری اُمیدوں کی محل کیونکر شکستہ ہو گئے۔ رنگین خواب ختم ہو گئے۔ آرزوؤں کا ستارہ غروب ہو گیا۔ بد نصیبی میرا کاشانہ بن گئی اور اب زندہ رہنے کے لیے کچھ باقی نہ بچا۔

اگر یہی ہونا تھا تو میرے دل کی ویرانی نے پہلے ہی سے کیوں نہ بتا دیا۔۔چُپکے سے سرگوشی کیوں نہ کر دی۔

ہوا کے گرم گرم جھونکے میرے بال پریشان کر رہے تھے، میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا۔ پودوں کے نیچے پژمردہ پھُول پڑے تھے۔کُچلے ہُوئی پتّے سُوکھی سُوکھی ٹہنیاں ہل رہی تھیں۔ مجھے غمگین روحوں کی سسکیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ دُور کوئی پرندہ بڑی دردناک آواز میں نالہ وشیون کر رہا تھا۔ لنج منج درخت کِس قدر وحشت ناک دکھائی دے رہے تھے۔ پیلی پیلی دُھوپ اور آسمان پر چھائے ہوئے گہرے غبار نے سارا ماحول کتنا غمگین بنا رکھا تھا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے سُنا کیا وُہ سچ ہے؟ کیا وُہ طرح طرح کے خواب واقعی پھیکے پڑ گئے، کیا وُہ امیدیں جھوٹی تھیں۔۔۔ وُہ پیارے لمحے چمکیلی صبحیں اور مسرّت سے لبریز شامیں، تصوّر کے وُہ رنگین جزیرے، وُہ پُراسرار قصر!

میرے خُدا! میں رنج والم کا یہ طوفان کیونکر برداشت کر سکوں گا۔ اب تو دُنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ ایسی اُجڑی ہُوئی اُداس زندگی کو لے کر کیا کروں گا؟

کِس قدر افسردگی میں میں گھر پہنچا۔ دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اب اندر نہ جاؤں بلکہ باہر نِکل جاؤں اور پھر کبھی نہ لوٹوں۔ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔ باغیچے کے بڑے قطعے میں ننھے بہن بھائی کھیل رہے تھے۔ مسرّت سے دمکتے ہوئے گلابی چہرے، شگفتہ باتیں۔۔۔ کیسے کھلونے سے لگ رہے تھے؟

چبوترے پر رکھے ہوئے کوچ پر امّی بیٹھی کچھ بُن رہی تھیں۔ دل چاہا کہ دوڑ کر اُن کی گود میں سر رکھ دوں اور اس قدر روؤں کہ جی ہلکا ہو جائے، لیکن پھر خیال آیا کہ یہ زخم ایسا کاری ہے کہ یوں مندمل نہ ہو گا۔ یونہی سوچتا رہا۔ خبطی سا، آوارہ سا، پاگلوں کی طرح سوچتا ہُوا باغیچے میں چلا گیا۔ ایک اُونچے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھیکی پھیکی دُھوپ ٹہنیوں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ کہیں دُھوپ تھی کہیں سائے۔ ہلتی ہُوئی لنج منج ٹہنیاں، اُڑتے ہوئے سُوکھے پتّے۔۔۔ کُچلے ہوئے پھُول۔۔۔ ہوا کے جھونکوں کی سسکیاں، وُہ شام کتنی ویران تھی۔ دُنیا کس قدر اداس معلوم ہو رہی تھی۔

پھر مَیں نے ایک درخت کے تنے پر ایک نام کھُدا ہوا دیکھا سوکھے ہوئے ہونٹ لرزنے لگے۔ دل میں اُمید کی ایک ننھی سی کرن ٹمٹمانے لگی۔ میں نے پاس جا کر پڑھا لکھا تھا۔۔۔ ''شفّو'' ایک مرتبہ تو میں مُسکرا ہی دیا بھیّا شفّو کا نام دیکھ کر۔

دیر تک میں ان کے کھدے ہوئے نام کو دیکھتا رہا۔ ان حروف کو جو انہوں نے خود لکھے تھے۔ نہ جانے کیا جادو تھا اس نام میں کیسی کیسی پرانی یادیں تازہ ہونے لگیں۔

کچھ تسکین سی مل گئی۔ تصویر میں وُہ چمکیلے دن پھرنے لگے جو ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔ میرے سامنے شفّو بھیّا کی جیتی جاگتی مورت آ گئی۔

اُنہیں باہر گئے ہوئے چند سال ہی گزرے ہوں گے، مجھے ایک ایک بات یاد تھی۔۔۔ لمبا قد، ترشا ہوا ورزشی جسم، گورے چٹّے، کشادہ سینہ، مُسکراتا ہوا چہرہ۔۔۔ لبوں میں دبے ہوئے سگریٹ کا بل کھاتا ہوا دھواں، کتنی کشش تھی اُس مُسکراہٹ میں، جب چلتے تھے تو کیا شان ہوتی تھی، کتنا وقار تھا، کتنے اچھے لگتے تھے۔ کیا مجال جو اتنی دیر کے لیے بھی اُداس ہوئے ہوں۔ کسی نے کچھ بھی کہا، لیکن بھیّا مُسکراتے رہیں گے۔ کہیں مایوسی ہُوئی تو مُسکرانے لگے۔ بڑی بُری خبر سُنی اور مُسکرا دیئے۔ جہاں جاتے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ میری

آنکھوں کے سامنے وُہ ساری تصویریں متحرک ہو گئیں۔ گزرتے ہوئے واقعات یاد آ گئے۔ کئی سال پہلے کی یادیں تازہ ہو گئیں۔۔۔ میرے بچپن کی۔

بھیّا اُن دنوں ایف۔ ایس۔ سی۔ میں پڑھتے تھے۔ پڑھتے کیا تھے۔ بس دو چار گھنٹوں کے لئے کالج چلے جاتے تھے۔ بقیہ وقت کھیل کود اور سینما وغیرہ میں صرف ہوتا تھا۔ کالج میں ڈراما کر رہے ہیں۔ مباحثوں میں حصّہ لے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں جا پہنچے اور ایسی غزل سُنائی کہ لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ وہاں سے تمغہ ملا۔ اُن کے کمرے میں چھوٹے بڑے ملا کر کل چالیس پچاس کپ رکھے تھے اور بے شمار تمغے۔۔۔ رات گئے ہم کھڑکی میں بیٹھ کر ماؤتھ آرگن سُنا کرتے۔ بھیّا کا کمرہ میرے کمرے سے بالکل نزدیک تھا۔

سیٹی کتنی اچھی بجاتے تھے۔۔۔ کیسی شگفتہ سُروں میں۔ صُبح صُبح سُورج کی شعاعوں کے ساتھ میں بھیّا کی سیٹیاں سُنائی دیتیں۔ ہم بچّوں میں سے انہیں کوئی بھی ملتا تو جھٹ ہاتھ کے اشارے سے خود سلام کرتے اور پھر کیسے کیسے لطیفے سُناتے۔

اپنے کالج میں کتنے مشہور تھے۔ کالج کے ہیرو تھے۔ سڑک پر جا رہے ہیں، جو لڑکا ملتا ہے سلام کرتا ہے۔ سب سے جان پہچان ہے۔ کالج میگزین دیکھ لو تو اس میں

ان کا کئی جگہ ذکر ہے۔ کئی تصویریں ہیں۔ شہر میں کہیں میچ ہو رہا ہے بھیّا شفّو ضرور کھیل رہے ہوں گے۔ ہر کھیل کو کتنی اچھی طرح کھیلتے تھے، تھے کتنے خوش قسمت۔۔۔ جس مقابلے میں شریک ہوئے جیت گئے، جو کچھ کیا وہی ہو گیا۔

اُنہیں چاندنی کتنی اچھی لگتی تھی۔ سردیوں میں اوور کوٹ پہنے باغیچے میں بیٹھے چاند کو تک رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ جواب میں مُسکرا دیئے اور پیار کر دیا۔ رات کو سو رہے ہیں تو کھڑکیاں کھلی ہُوئی ہیں اور چاندنی اندر آ رہی ہے۔

شام کو جو سب سے پہلے ستارے کو دیکھ کر دُعا مانگتے۔ ہمیں بھی یہ خبط ہو گیا تھا۔ جہاں سُورج غروب ہُوا اور سب کچھ چھوڑ کر تارے تلاش کرنے لگے۔

پھر مجھے آپا عذرا یاد آ گئیں۔ آپا ہم اُنہیں یونہی کہتے تھے۔ ہماری لگتی تو کچھ بھی نہ تھیں۔ ہمارے اُن کے کُنبوں کی جان پہچان تھی۔ مدّت کی واقفیت تھی۔ وُہ بھیّا شفّو پر جان چھڑکتی تھیں۔ شاید ہی کوئی ایسا دن ایسا گزرتا ہو گا جب وُہ ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوں۔ بھیّا صُبح کالج جاتے وقت لمبا چکر کاٹتے تھے۔ محض آپا عذرا کے لیے۔ جب وُہ سکول کے لیے تیار ہوتیں تو ہمیشہ بھیّا کا سائیکل اُن کی کوٹھی کے سامنے گزرتا اور بھیّا ہمیشہ وہاں کسی موٹر یا سائیکل سے ٹکراتے بچتے۔

آپا عذرا کتنی پیاری تھیں، کتنی خوبصورت تھیں۔ دعوتوں، شادیوں اور دوسرے موقعوں پر بے شمار لڑکیوں کو دیکھا۔ لیکن اُن جیسی لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ بچپن میں مجھے دو چیزیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ یا گلاب کی کلیاں اور یا رات کی رانی کی مہک۔ آپا عذرا کو دیکھ کر مجھے دونوں چیزیں یاد آ جائیں۔ وُہ کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتیں، کتنی ملائمت تھی اُن کے لہجے میں، میں ضد کرکے اُنہیں گلابی دوپٹہ اوڑھنے پر مجبور کرتا۔ کیونکہ اس طرح وُہ بالکل گلاب کی کلی لگتی تھیں۔

پھُولوں کے جھُرمٹ میں بھیّا شفّو اور آپا عذرا دونوں بیٹھے ہیں۔ آپا بھیّا کے بنائے ہوئے پھُول پتّوں کو کاڑھ رہی ہیں۔ بھیّا رنگ بتاتے جا رہے ہیں۔ اگر کہیں غلطی ہو گئی تو دونوں ہنس دیئے۔

دونوں ہنستے ہوئے کتنے معصوم لگتے تھے۔

پھر رات کو بھیّا بیٹھے ہمیں لطیفے سُنا رہے ہیں۔ یا کسی ناول کا کوئی دلچسپ حصّہ پڑھ رہے ہیں۔ اُچٹ کر نگاہ ایک کونے میں چلی جاتی ہے۔ آپا عذرا ٹکٹکی باندھے بھیّا کے چہرے کو دیکھ رہی ہیں۔ کیا مجال جو آنکھ ذرا جھپکتی ہو۔ کتنی کتنی دیر یُوں دیکھتی رہتیں۔

برج کھیلنے بیٹھتے تو آپا عذرا اور بھیّا پارٹنر بن کر سب کو ہرا دیتے۔ خوب جھگڑا ہوتا۔ بحث ہوتی کہ آخر تم دونوں نے پارٹنر بننے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے لیکن آپا عذرا اگر کھیلتیں تو بھیّا شفّو کی پارٹنر بن کر ورنہ ٹال مٹول کر جائیں۔ یہی حال بیڈ منٹن میں ہوتا۔

جب ہمارا اور اُن کا کُنبہ پہاڑ پر گیا تو ان دونوں نے ہمیں کیسی کیسی سیریں کرائیں۔ پکنک ہوئے۔ ہمیں کتنا ہنسایا۔ رات کو کھانے پر بھیّا کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہاں سمجھتے بھیّا وہاں ہوں گے۔ اُدھر سمجھتے آپا عذرا ہمارے ہاں ہوں گی۔ رات چاندنی ہوتی۔ میں سمجھ جاتا۔ وُہ دونوں کسی جھرنے کے پاس پتھروں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے۔

آپا عذرا چاندنی میں کتنی اچھی لگتیں۔ اُن دنوں ہمیں پریوں پر پورا عقیدہ تھا۔ ہم چاندنی میں اُنہیں پری سمجھتے جو رستہ بھول کر زمین پر رہ گئی ہو۔ شاید آپا عذرا کو بھی چاند دیکھنے کا اتنا ہی خبط تھا جتنا بھیّا کو۔

بھیّا پنسل سے کیسی اچھی تصویریں بناتے۔ جس کی تصویری بناتے اُس سے ہو بہُو شکل مل جاتی۔ ہمارے کارٹون بنتے۔ لیکن زیادہ تر آپا عذرا کی تصویریں ہوتیں۔ چھوٹی چھوٹی تصویروں کا انلارجمنٹ کرتے۔

ایک مرتبہ بھیّا بیمار پڑ گئے۔ آپا گھبرائی ہُوئی ہمارے ہاں آئیں۔ سارا سارا دن اُن کے پلنگ کے پاس بیٹھی رہتیں۔ رات گئے واپس جاتیں۔ کتنی بے چین رہتی تھیں۔ اُنہی دنوں ایک رات کو میں بھیّا کے کمرے میں گیا۔ آپا سرہانے بیٹھی تھیں۔ کھڑکی سے چاندنی اندر آرہی تھی اور بھیّا کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ کمرے میں رات کی رانی کی مہک تھی۔ آپا نے ہلکا ہلکا گُلابی لباس پہن رکھا تھا۔ گڑیا سی لگ رہی تھیں۔ چاندنی میں اُن کے دوپٹے کا روپہلی پلّو جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ شاید اُن کی آنکھوں میں دو ننھے موتی سے آنسو جھلک رہے تھے۔ وُہ اپنی لمبی لمبی اُنگلیوں سے بھیّا کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ بیمار ہونے پر بھی بھیّا حسبِ معمول مُسکرا رہے تھے۔ میں سوچتا رہا کہ ہمارے سر میں ذرا سا درد ہو جائے تو طرح طرح کے مُنہ بناتے ہیں اور بھیّا ہیں کہ انہیں پرواہ ہی نہیں۔

آپا عذرا کے پاس اُن کے ابّا کی کھینچی ہُوئی تین چار بہت اچھی تصویریں تھیں۔ بھیّا شفّو نے اُن کے لیے بڑی ضد کی، لیکن آپا نے نہ دیں۔ کہتیں کہ آپ اوروں کو دکھائیں گے۔ بھیّا قسمیں کھاتے۔ ایک دن بولے۔ لاؤ عہد نامہ لکھ کر دستخط کر دوں کہ کسی کو نہیں دکھاؤں گا۔ لیکن آپا نہ مانیں۔ بھیّا نے مجھے سکھا پڑھا کر بھیجا کہ تصویریں اُٹھا لاؤں، لیکن میں اپنی حماقت سے پکڑا گیا اور تصویریں نہیں ملیں۔ میں آپا عذرا سے خوب لڑا کہ آپ نے تو بھیّا کی درجنوں تصویریں رکھی

ہُوئی ہیں۔ البم میں، دراز میں، اپنے لاکٹ میں۔۔۔ اور انہیں اپنی ایک تصویر بھی نہیں دیتیں۔ ایک چاندنی رات کو میں آپا عذرا کو چھوڑنے جارہا تھا۔ ہم دونوں باغ میں سے گزر رہے تھے کہ اتنے میں ہمیں بھیّا مل گئے جو کھیل کر واپس آرہے تھے۔ وُہ بھی ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ بھیّا نے کالج کا بلیزر پہن رکھا تھا۔ گلے میں زردی رنگ کا مفلر، ویسے ہی رنگ کی پتلون، کرکٹ کے جوتے۔ بال پریشان تھے۔ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ میں ایک طرف کو ہو گیا۔ وُہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کیسے پیارے لگ رہے تھے۔ میں نے دِل میں دُعا مانگی کہ خدا کرے یہ دونوں یونہی ہنستے کھیلتے اکٹھے چلا کریں۔

ایک چمکیلی صُبح کو میں بھیّا کے کمرے میں کچھ لینے گیا۔ دیکھا کہ ایک خوشنما ڈبہ گلابی ربن میں بندھا رکھا ہے۔ میں نے پُوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے شاید اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ بولے پتہ نہیں۔ نہ جانے کون رکھ گیا ہے؟

اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک طرف لکھا تھا۔ ”عذرا کی طرف سے آپ کی سالگرہ پر۔“ ہم جیسے چونک پڑے۔ آج اُن کی سالگرہ ہے کیا؟ بھیّا کو خود پتہ نہیں تھا۔

اس دن بھیّا کی سالگرہ منائی گئی۔ لیکن اگر آپا نہ بتاتیں تو شاید کسی کو بھی پتہ نہ چلتا۔ شام کو آپا آئیں تو میں مچل گیا کہ بتایئے آپ کو کس طرح پتہ چلا کر آج بھیّا

کی سالگرہ ہے۔ بولیں ڈائری میں لکھا تھا۔ میں نے کہا نہیں۔ بولیں ایک کتاب پر لکھا تھا۔ میری تسلی نہ ہُوئی اور پوچھے گیا۔ آخر بولیں مجھے زبانی یاد تھا۔

بھیّا ہر ہفتے نئی نئی کتابیں لاتے اور آپا عذرا کے ہاں بھجوا دیتے۔ ایک دن بہت سی کتابیں آپا واپس لائیں۔ ایک آسان سی کہانیوں کی کتاب میں اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ اب جو پڑھتا ہوں تو ہر تیسرے چوتھے صفحے پر شفّو بھیّا کا نام لکھا ہے۔ جہاں جہاں تصویریں ہیں وہاں پھولوں میں، درختوں پر، پتّوں پر چھپا چھپا کر لکھا ہوا ہے۔ میں سوچنے بیٹھ گیا۔ آپا عذرا ان کے نام کی تسبیح کرتی رہتی ہیں کیا؟

ایک بات عجیب تھی۔ نہ جانے آپا کو کِس طرح پتہ چل جاتا کہ آج بھیّا خوش ہیں یا آج اُن کی طبیعت اچھی نہیں۔ اِسی طرح بھیّا بھی بتا دیتے۔ ایک دن وُہ کالج سے واپس آئے۔ آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ میں کمرے میں دُبکا ہوا اپنے میکینو کے سیٹ سے کھیل رہا تھا۔ بولے چلو اُن کے ہاں چلتے ہیں۔ میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ وُہ کہنے لگے ہمیں ضرور جانا چاہیئے۔ اس وقت وُہ اداس ہیں۔ پُوچھا کہ آپ کو کیوں کر پتہ چلا، بولے یونہی، میرا دل کہہ رہا ہے۔ ہم وہاں گئے تو آپا عذرا

سچ مچ اُداس بیٹھی تھیں۔ کسی چھوٹے موٹے امتحان میں فیل ہو گئی ہوں گی یا نہ جانے کیا بات تھی۔ بھیّا نے خوب مزیدار باتیں کیں۔ اُنہیں خوب ہنسایا۔

اُسی شام کو آپا عذرا ہمارے ہاں آئی ہُوئی تھیں۔ ریڈیو سُن رہے تھے۔ ایک لمبے سے صوفے پر میں اور آپا بیٹھے تھے۔ بھیّا شفّو آئے۔ دو چار صوفے اور رکھے تھے لیکن اُن پر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ آپا کی چند سہیلیاں بھی تھیں اور کہیں جگہ نہ تھی۔ بھیّا میرے برابر بیٹھ گئے۔ کچھ کام تھا مجھے باہر جانا پڑا۔ جب واپس آیا تو دیکھتا ہوں کہ سب مُسکرا رہے ہیں اور بھیّا اور آپا کو دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ایک خاتون سے چپکے سے پوچھا۔ بات کیا ہے؟ اُنہوں نے ریڈیو کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بھیّا اور آپ عذرا کی طرف۔ کوئی بہت اچھا گویّا گا رہا تھا۔ دو شعر مجھے اب بھی یاد ہیں۔ ایک تھا:

ہر لمحہ ایک تازہ شکایت ہے آپ سے

اللہ! مجھ کو کتنی محبّت ہے آپ سے

آپا عذرا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ پہلے ہی گلابی تھیں، اب تو بالکل بیر بہوٹی بنی ہُوئی تھیں۔ بھیّا مُسکرا رہے تھے۔ لیکن اُن کی نگاہیں نیچی تھیں اور ماتھے پر پسینہ آیا ہوا تھا۔ دوسرا شعر تھا۔

کیا آپ جانتے ہیں مجھے تو خبر نہیں

کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبّت ہے آپ سے

اس شعر پر تو سب ایک دوسرے کی جانب اشارے کرنے لگے۔ آپا اور بھی سُرخ ہو گئیں۔ بھیّا اتنے شرمائے کہ جلدی سے بہانہ کر کے باہر چلے گئے اور ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

پھر یہ شعر کتنا چلا، بھیّا اور آپا عذرا کو خوب چھیڑا گیا۔

ہمارے ہاں کوئی پارٹی تھی۔ رات کو ہم باغیچے میں بیٹھے تھے۔ امّی اور بزرگ خواتین اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ آپا عذرا، میں، بھیّا شفّو اور چند لڑکیاں باقی رہ گئے۔ چوتھی یا پانچویں کا چاند سرو کے درختوں میں سے جھانک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بدلیاں آسمان میں تیر رہی تھیں۔ ہم پھُولوں میں گھِرے بیٹھے تھے۔ ہوا کے معطّر جھونکے آ رہے تھے۔ وُہ بالکل ایسی رات تھی جیسی پریوں کی کہانیوں میں ہوا کرتی ہے۔

بھیّا شفّو بولے۔ ”میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔“ ہم سب متوجّہ ہو گئے۔

بولے۔۔۔ ”میں نے دیکھا کہ تیرہ و تاریک آسمان میں ایک پتلا سا چاند چمک رہا ہے۔ اُس کی دونوں نوکیں پکڑے کوئی وہاں بیٹھا ہے اور میں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔“

ہم نے پوچھا۔ ”وُہ کون تھا؟“ انہوں نے آپا عذرا کی طرف اشارہ کر دیا۔ بولے۔ ”یہ تھیں۔“ پھر بولے۔ ”جیسے انہوں نے مجھے اُوپر آنے کو کہا لیکن میں نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ یہ آسمان پر تھیں اور میں زمین پر۔“ میں نے کہا تم مجھ سے بہت دُور ہو۔ اُنہوں نے مجھے دو چار مرتبہ بُلایا۔ جب میں تھک کر بیٹھ گیا۔ تو یہ کھِلکھِلا کر ہنس دیں، بولیں۔ ”آپ یہاں ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ میں آپ سے بہت دُور ہوں۔ اتنے میں میری آنکھ کھُل گئی!“

ہم سب ہنس پڑے۔ بھیّا کو بھی کیا بچّوں جیسے خواب نظر آتے ہیں۔ ایسے خواب تو ہمیں دکھائی دینے چاہئیں۔ لیکن آپا عذرا سنجیدہ رہیں۔ انہوں نے یُوں ظاہر کیا جیسے وُہ اس خواب کو پہلے سے جانتی ہوں۔ یا اُنہوں نے بھی یہی خواب دیکھا ہو۔ پھر دیر تک ہم پھُولوں میں گھِرے ہوئے چمکیلے چاند کے نیچے بیٹھے پریوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

کئی دنوں کے بعد ہم پھر اُسی جگہ بیٹھے تھے۔ اندھیری رات تھی۔ آپا اپنی کار کا انتظار کر رہی تھیں۔ پھولدار بیلوں میں ایک چھوٹا سا بجلی کا قمقمہ لگا ہُوا تھا جس کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔ ہم ایک چھوٹے سے ڈرامے کی باتیں کر رہے تھے جسے سٹیج کرنے کا ارادہ تھا۔

یکایک بھیّا بولے۔ "اگر کہو تو ایک خواب سُناؤں؟" ہم سب نے کہا۔ "ضرور۔"

کہنے لگے۔ "کل رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ایک اُجاڑ میدان ہے۔ کالے کالے پتھر کھڑے ہیں۔ آسمان پر مٹیالا غبار چھایا ہوا ہے۔ میں چلا جا رہا ہوں۔ بڑے وحشت ناک راستے کو عبور کرنے کے بعد ایک ٹوٹے پھُوٹے قلعے کے دروازے پر پہنچا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اُداسی تھی۔ کچھ عجیب سی مورتیں چُپ چاپ اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ کوئی مجھے قلعے کے اندر لے گیا۔ اندر مجھے شعلے نظر آئے۔ سسکیاں سُنائی دیں۔ ایک پیچیدہ راستہ طے کر کے میں ایک میدان میں پہنچا جہاں بڑا ہجوم تھا۔ ایک اُونچے سے ٹیلے پر کوئی کھڑا تھا۔ بہت غمگین!"

"کون کھڑا تھا؟" ہم سب پوچھنے لگے۔

"یہ تھیں!" انھوں نے آپا عذرا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ہم نے آپا کو دیکھا۔ اُن کے چہرے پر کتنی اُداسی تھی۔

وُہ بولیں۔ "اس کے بعد میں بتاؤں کیا ہوا؟"

ہم حیران وہ گئے۔ کیا ایک ہی خواب ان دونوں کو نظر آیا تھا؟

وُہ کہنے لگیں۔ "پھر جیسے اُنہوں نے چاہا کہ میرے پاس آ جائیں اور مجھے وہاں سے باہر نکال لیں۔ لیکن یہ بالکل بول نہ سکے۔ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ دیر تک یہ یونہی کھڑے تکتے رہے۔ اس کے بعد ایک آندھی آئی۔۔۔ اور۔۔۔!"

"تمہیں کیا پتہ؟" بھیّا نے تعجّب سے بولے۔

"یہی خواب رات میں نے دیکھا تھا۔"

"عجیب بات ہے" بھیّا بولے۔

ہم سب خاموش ہو گئے۔ اُس اندھیری رات میں ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے نیچے دیر تک بیٹھے اس خواب کے متعلق سوچتے رہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے کئی تارے ٹوٹے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ درختوں سے کبھی کسی پرندے کی

آواز آجاتی۔ فوّارے کی دھیمی دھیمی صدا ہمیں چونکا رہی تھی۔ اُس رات مجھے بڑا اڈر لگا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں اور چچا جان ہمیں اپنے ساتھ پہاڑ پر لے گئے۔ آپا عذرا ہمیں بہت یاد آئیں۔ بھیّا شفّو ہمیں سارا دن سیر کراتے۔ پکنک ہوتے، بوٹنگ کرتے، جھیلوں میں تیرتے، مچھلیاں پکڑتے۔۔۔ تصویریں اُتاری جاتیں۔ غرضیکہ وُہ دن بڑی دلچسپی سے گزر رہے تھے۔ ہم بعض اوقات تو چاندنی راتوں میں صُبح تک باہر پھرتے رہتے۔ بھیّا ماؤتھ آرگن پر کوئی دُھن بجارہے ہیں اور ہم اُن کے ساتھ مارچ کر رہے ہیں۔

ایک دن دیکھا کہ بھیّا واپس جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ وجہ پوچھی تو بولے۔ یونہی جی چاہتا ہے کہ واپس چلیں۔

جب وُہ جانے لگے تو میں مچل گیا کہ دراصل وجہ کیا ہے؟ آپ ہمیں چھوڑ کر کیوں جارہے ہیں؟

چلتے چلتے بولے۔ ’’کسی کو بتانا مت۔ مجھے رات ایک بہت ڈراؤنا خواب دکھائی دیا ہے!‘‘

’’آپا عذرا کے متعلق؟‘‘ میں نے پُوچھا۔

"ہاں۔"

جب وُہ چلے گئے تو ہم سب اداس ہو گئے۔ نہ کوئی صُبح صُبح سیٹیاں بجاتا، نہ ہمیں قوسِ قزح اچھی لگتی، نہ شفق، نہ ہمیں کوئی سیر کو لے جاتا۔

پھر ایک بہت بُری خبر سُنی۔ آپا عذرا کی شادی ہو رہی تھی۔ بھیّا شفّو سے نہیں، کسی اور سے۔

ہمیں بالکل یقین نہ آیا۔ جب چچا ابّا نے کہا کہ سچ مُچ ہو رہی ہے۔ تب ہم کتنے روئے۔ مجھے بخار چڑھ گیا۔

چند ہفتوں کے بعد آپا کی شادی ہونی تھی۔ آپا اب ہمارے یہاں نہیں آتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے بُلایا اور ایک خط دیا۔ بولیں اپنے بھیّا کو دینا اور جواب کی تاکید کی۔ اُن کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھیں پُر نَم تھیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میں نے خط بھیّا کو دے دیا اور جواب مانگا۔ بھیّا نے ایک کتاب میں سے صفحہ کاٹ کر مجھے دے دیا۔ انگریزی کی کوئی نظم تھی۔ دو تین سال کے بعد جب میں نے اپنے کورس میں وہی نظم پڑھی تو کتنی اچھی لگی۔ میں نے اُس نظم کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ زبانی یاد ہو گئی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے خط کے جواب میں وُہ نظم

کیوں بھیجی تھی۔ نظم کچھ یوں تھی ”جب تم عمر رسیدہ ہو جاؤ۔ یہ ریشم کے لچھوں جیسے بال یوں چمکنے لگیں جیسے چاندی کے تار۔ یہ حسین کٹورے سی آنکھیں دُھندلی پڑ جائیں۔ اس چاند سی پیشانی پر وقت جھُریاں ڈال دے۔ جب کبھی اپنے کُنبے میں بیٹھی اُنہیں نصیحتیں کو رہی ہو۔ تب سوچنا کہ تمہاری آنکھوں میں کتنی ملائمت تھی۔ کتنا سحر تھا۔ سنہرے بالوں کی پریشان لٹیں تمہارے دمکتے ہوئے چہرے پر کتنی اچھی لگتی تھیں۔ تمہاری مُسکراہٹ کتنی دلفریب تھی۔ تم کتنی خوبصورت تھیں۔ تم فرشتوں کا تخیل تھیں، حوروں کا خواب تھیں۔ اُس وقت ایک بدنصیب کو بھی یاد کرنا جو تمہارا پرستار تھا۔ جو تمہارا نام لے لے کر جیتا رہا۔ جس نے اس حسین مجسمے کی حسین روح کو چاہا۔ کتنے خوش گوار تھے وُہ لمحے جو اُس نے تمہارے پاس گزارے۔ پھر یاد کرنا کہ محبّت کتنی حسین چیز ہے جو اُفق کے اس طرف طلوع ہُوئی۔ جس سے زمین و آسمان سب کچھ جگمگا اُٹھا۔ پھر اُفق کے اُس پار چلی گئی اور تاروں کے کسی جھُرمٹ میں اپنا مُنہ چھپا لیا۔“ آپا عذرا یہ نظم پڑھ کر کتنی روئی تھیں۔ اس سے پہلے وُہ میرے سامنے کبھی نہیں روئیں۔ لیکن اُس دن تو جیسے آنسوؤں پر ان کا قابو نہ رہا۔ اُس صفحے کو تہہ کر کے اپنے لاکٹ میں رکھ لیا۔

آپا عذرا کی شادی ہُوئی۔ ایک ٹھگنے سے صاحب کے ساتھ، جو سانولے بھی تھے اور عُمر میں بھی بڑے تھے۔ کچھ موٹے بھی تھے۔ ہمیں وُہ ذرا نہ بھائے۔ البتہ سُنا تھا کہ آپا عذرا کے ابّا کو وُہ بہت اچھے لگتے تھے۔ بھیّا شفّو اُن سے بڑے گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ اُنہیں اپنے ہاں بھی لائے۔ اپنی لائبریری دکھائی۔ سارے البم دکھائے۔ اکٹھے سینما گئے۔ پھر شادی میں بھیّا کتنی گرمجوشی سے کام کرتے رہے۔ اندر باہر ہر جگہ بھیّا انتظام کرتے پھر رہے ہیں۔ ہم سب حیران تھے کہ بھیّا کِس مٹّی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر غم کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ ان کا دل کتنا وسیع ہے۔ جہاں رنج والم سب سما جاتے ہیں اور چہرے پر اداسی کی لہر تک نہیں آتی اور بدستور مسکراتے رہتے ہیں۔

دولھا میاں کے اصرار پر بھیّا کو اور مجھے چند اسٹیشن ساتھ جانا پڑا۔

برابر کے ڈبے میں آپا عذرا تھیں۔ بھیّا شفّو کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وُہ ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ ٹرین بڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ باہر گرد وغبار کا طوفان تھا۔ لیکن وُہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ جانے آپا عذرا کی آنکھوں میں دھواں چلا گیا تھا یا کوئلے کا زرّہ۔۔۔ اُن کی

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وُہ رو رہی تھیں۔ کتنی بے کسی تھی اُن کی آنکھوں میں، کتنا درد تھا؟ میں بے چین ہو گیا۔

اس کے بعد بھیّا کی قسمت پلٹ گئی۔ وُہ ہر جگہ پیچھے رہنے لگے۔ ہر مقابلے میں ہارنے لگے۔ جن جن کھیلوں کے وُہ اتنے اچھے کھلاڑی تھے۔ اُن میں ایسے پھسڈی ہو گئے کہ سب حیران وہ گئے۔ جیسے اُن میں قوّتِ ارادی باقی نہ رہی۔ ہر جدوجہد میں رہ جاتے۔ جو کام شروع کرتے وُہ بیچ میں چھوڑنا پڑتا۔ بڑی محنت کے بعد بھی کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوتا۔ اب بھیّا تھے اور متواتر ناکامیاں، مایوسیاں۔

ہم روز سُنا کرتے۔ آج بھیّا مکہ بازی میں ہار گئے۔ آج کرکٹ میں یونہی آؤٹ ہو گئے۔ آج بولنگ فضول کی۔ وہی ڈاکٹری جس میں وُہ پہلے بڑے اچھّے نمبر لیتے تھے۔ فورتھ ائیر میں فیل ہوتے ہوتے بچے۔ مریضوں کا اُنہیں ایسا خبط تھا کہ صُبح شام ہسپتال بھاگے جارہے ہیں۔ مریضوں کو بنائیں گے۔ اُن کے لیے تحفے لے کر جائیں گے۔ اب نہ کالج کی پروا تھی نہ ہسپتال کی۔ سارا سارا دن غائب رہتے۔ اکیلے دریا پر گئے ہوئے ہیں۔ کشتی چلا رہے ہیں۔ اکیلے باغوں میں گھوم رہے ہیں۔ اُن کے کمرے میں رات کو دیر تک روشنی رہتی۔ پڑھائی کم کر دی تھی۔ فلمیں بہت دیکھنے لگے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود اُن کی شگفتگی بدستور

تھی۔ صُبح صُبح اُن کی سیٹیاں برابر سُنائی دیتیں۔ ہمیں سلام بھی کرتے، ماؤتھ آرگن سُناتے، تصویریں اُتارتے، ہمارے ساتھ خوب کھیلتے۔

پھر اُن کا ڈاکٹری کا آخری امتحان ہوا۔ ہم سُنا کرتے تھے کہ بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہے۔ لیکن بھیّا نے بڑی بے دِلی سے تیاری کی۔ کتاب سامنے رکھی ہی نگاہیں کھڑکی کے باہر افق پر جمی ہُوئی ہیں۔ کبھی کبھی مُسکرا کر سیٹی بجادی اور پھر باہر دیکھنے لگے۔

امتحان ہوا۔ نتیجہ سُنا تو ہم دم بخود ہو گئے۔ بھیّا فیل ہو گئے۔۔۔ جو آج تک کسی چھوٹے سے امتحان میں بھی فیل نہ ہوئے تھے۔ اتنے اچھّے طالبعلم تھے۔ پہلی مرتبہ فیل ہوئے تھے۔

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہمارے پڑوس کی کوٹھی میں ایک لڑکی بھیّا کو پسند کرنے لگی۔ نہ جانے کب سے انہیں چھُپ چھُپ کر دیکھتی تھی۔ بیچاری نے کیسے جتن کئے۔ کِن کِن بہانوں سے اُن سے ملی۔ مجھے تنگ کر دیا۔ جب وہاں سے گزرتا پکڑ لیتی۔ دیر تک بٹھائے بھیّا کی باتیں پوچھتی رہتی۔ زبانی پیغام بھیجے، خط بھیجے، اپنی تصویریں بھیجیں۔ میں بہتیرا انکار کرتا۔ لیکن اُس کے سامنے ایک نہ چلتی۔ کچھ اتنی بُری بھی نہ تھی۔ شمیم یا نسیم کچھ ایسا ہی نام تھا۔۔۔ مجھے کبھی

اچھی نہ گئی۔ بھیّا نے کبھی اُس کے خط کا جواب نہیں دیا۔ اُس کے تحفے قبول نہیں کئے۔ ایک دفعہ تو اس نے بھیّا کا راستہ روک لیا اور بڑی بے کسی سے پوچھا۔ ”آپ میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟“ وُہ مُسکرا کر ٹال مٹول کر گئے۔

بعد میں تو مجھے اُس پر ترس آنے لگا۔ پھر اس کے ابّا کا تبادلہ ہو گیا چلتے وقت اُس نے بڑی منّتوں سے بھیّا کو بُلایا، بڑی التجا سے۔ وُہ ملنے گئے۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وُہ ایک برسات کی اندھیری رات تھی۔ بارش ابھی ابھی تھمی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وُہ دیر تک بھیّا کے سامنے کھڑی روتی رہی۔ بھیّا سے رومال مانگا جو انہوں نے دے دیا۔ اگلے روز وُہ بیچاری چلی گئی۔ اُس کے چند خط بھی آئے لیکن کسی کا جواب نہیں دیا گیا۔ پھر کوئی خط نہ آیا۔

بھیّا بیمار ہو گئے۔ دن بھر اُن کے کمرے میں جمگھٹا لگا رہتا۔ کیسی کیسی ناز برداریاں کی جاتیں۔ رات کو مَیں اُن کے کمرے میں گیا۔ مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ باہر چاندنی چھٹکی ہُوئی ہے۔ میں نے روشنی بجھا کر کھڑکیاں کھول دیں۔ بھیّا کے چہرے پر چاندنی آ گئی۔ وُہ کیسے خوش ہوئے۔ پوچھا کون ہے؟ میں پاس جا کھڑا ہوا۔ اُنہوں نے مجھے کتنا پیار کیا۔ اور کیسی اچھی باتیں کیں۔ وُہ چاند کو تکتے رہے۔ ٹکٹکی باندھے دیکھتے

رہے۔ اُن کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ نہ جانے وُہ کون سی کھوئی ہوئی جنّت کی جھلک دیکھ رہے تھے؟ وُہ کون سے خواب تھے جو چاندنی میں جھلملا رہے تھے؟ اُنہیں کیایاد آرہاتھا؟

جب اچھّے ہوئے تو ایک پارٹی دی گئی۔ ہمارے ہاں بڑی رونق تھی۔ چند خواتین بڑی دُور سے آئی تھیں۔ اُسی کمرے میں بیٹھے ریڈیو سُن رہے تھے۔ بھیّا اور میں اُسی صوفے پر بیٹھے تھے۔ ایک خاتون نے بھیّا سے بولیں۔ ”میاں وُہ شعر تمہیں یاد ہے نا؟“

یہ بولے۔ ”کون سا؟“

بولیں۔۔۔ ”وہی۔۔۔ کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبّت ہے آپ سے۔۔“ میں پریشان ہو گیا۔

بھیّا مُسکرا کر بولے۔ ”ہاں یاد ہے۔“

وُہ بولیں۔ ”وُہ شعر والی محترمہ اب کیسی ہیں؟“

مجھ پر گویا بجلی گر پڑی، سوچنے لگا۔ اب بھیّا کیا جواب دیں گے۔ لیکن وُہ بدستور مُسکراتے رہے بولے۔ ”اب وُہ کہیں اور چلی گئیں۔۔۔۔!“

وُہ بولیں۔ ''کہاں جاسکتی ہیں بھلا۔۔۔؟''

یہ بولے۔ ''اُن کی شادی ہوگئی۔'' وُہ بیچاری دن بھر کیسی چُپ چاپ رہیں۔

چند دنوں کے بعد بھیّا کی سالگرہ تھی۔ صُبح صبح بھیّا کے نام ایک لفافہ آیا۔ گلابی رنگ کا، جس میں رات کی رانی کی مہک تھی۔ میں نے جھٹ پہچان لیا۔ طرزِ تحریر آپا عذرا کا تھا۔ کھول کر دیکھا تو وہی تین تصویریں تھیں۔ نہ کوئی خط نہ اُن تصویروں پر کچھ لکھا تھا۔

میں کتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ پہلے تو اتنی کوششوں پر بھی یہ تصویریں بھیّا کو نہ مل سکیں اور اب کتنی آسانی سے مل گئیں۔

ہسپتال میں کسی مریض کے لیے بہت خون کی ضرورت تھی۔ اتنا خون کہ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بھیّا چپکے سے جا کر خون دے آئے۔ واپس آئے۔ بازو میں پٹّی بندھی ہے۔ چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ مُسکراتے ہوئے آرہے ہیں۔

بھیّا نے دوسری مرتبہ ڈاکٹری کا امتحان دیا۔ ہمیں اُمید تھی کہ اس مرتبہ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ وُہ پھر فیل ہوگئے۔ ان ناکاموں پر ہمیں یقین نہ آتا تھا۔ یہ تو اتنے خوش قسمت تھے کہ جب بغیر پڑھے امتحان میں بیٹھتے تھے تو پاس ہو

جاتے تھے اور اب یہی ہیں کہ محنت کرنے پر بھی رہ جاتے ہیں۔ کئی روز گھر میں سب اداس رہے۔

ایک دن آپ عذرا کا میرے نام خط آیا۔ وُہ کہیں جا رہی تھیں۔ اُن کی ٹرین ہمارے پر آدھ گھنٹہ ٹھہرتی تھی۔ لِکھا تھا مجھے آکر ملو۔ ٹرین کے وقت سے پہلے میں اور بھیّا موٹر سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ آدھی دور جا کر ایک اُجاڑ سی جگہ موٹر سائیکل بگڑ گیا۔ پہلے خود کوشش کی، پھر اُسے کھینچ کر مرمت کے لیے لے گئے۔ وہاں انتظار کرنا پڑا۔ معلوم ہوا ابھی دیر لگے گی۔ ایسا اتفاق ہوا کہ سڑک پر کوئی موٹر نہ ملی نہ کوئی تانگہ۔ آخر پیدل بھاگے۔ جب پلیٹ فارم پر پہنچے تو اُن کی ٹرین آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ آپا عذرا کو کہیں دیکھ لیں، لیکن نہ دیکھ سکے۔ میرا جی بھر آیا۔ چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ ایک بنچ پر بیٹھ کر رومال سے آنسو پوچھنے لگا۔ بھیّا نے میرا ہاتھ پکڑا اور سٹال پر لے گئے۔ وہاں مجھے چاکلیٹ، ٹافیاں اور جانے کیسی کیسی چیزیں لے کر دیں اور پھر ہنساتے ہوئے واپس لے آئے۔

اگلے مہینے میرا امتحان ختم ہُوا اور میں امّی کو چھوڑنے چلا گیا۔ ایک اسٹیشن پر آپا عذرا مل گئیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ تھیں۔ وُہ کہیں سے واپس آرہی تھیں۔ میں

انہیں دیکھ کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کیا یہ وہی آپا عذرا ہیں؟ کتنی دُبلی پتلی اور غمزدہ نظر آ رہی تھیں، جیسے برسوں کی بیمار ہوں۔ جن ہونٹوں پر ہمیشہ مُسکراہٹ کھیلتی تھی اب وُہ کتنے افسردہ لگ رہے تھے۔ چہرے کی چمک دمک اب کہاں چلی گئی تھی؟ انہوں نے مجھے بہت پیار کیا۔ بڑی اچھی اچھی باتیں کرتی رہیں۔ ایک گھنٹہ تک ہم اکٹھے رہے۔ کئی مہینوں میں امّی کے ساتھ رہا۔ بھیّا مجھے یاد آتے۔ ایک دن پتہ چلا کہ بھیّا پاس ہو گئے۔ اب وُہ ڈاکٹر بن گئے تھے۔ میں امّی کو ساتھ لے کر سیدھا گھر بھاگا۔ بھیّا کو مبارکباد دی۔ ہمیں بڑی خوشی ہُوئی۔ اس کے بعد کئی مہینوں تک بھیّا کے مستقبل کے پروگرام بنائے گئے۔ شادی کے لئے زور دیا گیا۔ امّی، ابّا، چچا ابّا۔۔۔ سارے بزرگ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے۔ بیسیوں جگہ سے پیغام آئے لیکن بھیّا انکار ہی کرتے رہے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے۔ ابّا نے بھیّا سے پوچھا، "تو آخر تمہارا ارادہ کیا ہے؟ کیا عمر بھر کنوارے رہو گئے؟"

بھیّا بڑا سنجیدہ چہرہ بنا کر بولے۔ "دیکھئے نا جہاں کُنبے میں سب کے سب ذمّہ دار اور عقلمند ہوں۔ وہاں ایک مجھ سا پگلا بھی ہونا چاہئے، جسے مثال کے طور پر پیش کیا جاسکے۔"

سب ہنس پڑے۔

بزرگوں کے بنائے ہوئے پروگرام یونہی دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک اداس سی سہ پہر کو بھیّا ہم سے کئی ہزار میل دُور چلے گئے۔ سی پی میں یا شاید وہاں سے بھی آگے، اپنے کسی دوست کے ساتھ۔

ہم سب مہینوں تک اُنہیں یاد کرتے رہے۔ سارا کُنبہ اُن کے لیے اداس رہا۔ دعائیں مانگیں کہ وُہ واپس آ جائیں اور یہیں رہیں۔ سال بھر کے بعد وُہ واپس آئے۔ اب تک اکیلے ہی تھے۔ چند روز ٹھہر کر واپس چلے گئے۔

اُن کے خط آیا کرتے تھے جن میں وہی شوخیاں، وہی شگفتگی ہوتی۔

میں اپنے سالانہ امتحان میں منہمک ہو گیا۔ گرمیوں میں پہاڑوں پر پھرتا رہا۔ ذہن میں اُن کی تصویریں دُھندلی پڑ گئیں۔

آہستہ آہستہ اُن کی باتیں ہمارے دلوں سے اُترتی گئیں۔ آپا عذرا کو دیکھے بھی مدّت گزر گئی۔ کبھی دوسرے تیسرے مہینے بھیّا کا خط آیا۔ کچھ دیر کے لئے ہنس لئے بس۔

لیکن اُن کی مُسکراہٹ ہمیشہ میرے لیے رہنما ہی رہی۔ صُبح صُبح مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی باغ میں سیٹیاں بجارہاہو۔ ویسی شگفتہ سُروں میں۔ اُن کی تصویریں دیکھ کر میں کتنا خوش ہوتا۔

میں نے درخت پر کھُدے ہوئے نام کو دیکھا۔ مجھے شفّو بھیّا کتنے قریب محسوس ہوئے۔ جیسے میرے سامنے کھڑے مُسکرا رہے ہوں۔ مجھے کتنی تسکین ہُوئی۔ کسی نے دل کے زخم پر مرہم رکھ دیا۔ جیسے طوفان زدہ اندھیری رات میں کوئی مسافر حوصلہ ہارنے کو ہو اور یکایک تیرہ و تاریک آسمان پر کسی بدلی کی اوٹ سے ایک چمکیلا تارہ جھانکنے لگے اور مسافر کسی نامعلوم اُمید پر پھر جدوجہد شروع کر دے۔ شفّو بھیّا کا دل کیسا تھا؟ جو غموں سے جھُکا، نہ آفتوں نے اس پر کوئی اثر کیا۔ مایوسیوں کے کیسے طوفان آئے لیکن اُسے نہ ہلا سکے۔

وُہ معصوم سا چہرہ لبوں پر کھیلتی ہُوئی مُسکراہٹ، سگریٹ کا بل کھاتا ہوا دھواں۔ جب آتے تھے تو گویا کرنیں ساتھ آتی تھیں۔ عجیب عجیب مسرّتیں ساتھ لاتے تھے۔ وُہ پیاری سی مُسکراہٹ ہمارے لیے ایک نعمت تھی۔

اور اب!۔۔۔ اب بھی اُن کی وہی اُجاڑ زندگی ہو گی۔۔۔ تنہا بے کیف زندگی! لیکن اُن کا چہرہ اب بھی روشن ہو گا۔ شکایت کا ایک لفظ بھی اُن کے لبوں پر نہ آتا

ہو گا۔ مریضوں کا آدھا دُکھ تو وُہ اپنی میٹھی باتوں سے دور کر دیتے ہوں گے۔ رنگ برنگ پھولوں کا اب بھی شوق ہو گا۔ باغ میں اب بھی صُبح صُبح سیٹیاں بجاتے ہوں گے۔ چاند دیکھنے کا خبط شاید پہلے سے کہیں زیادہ ہو گا۔

بھیّا شفّو کی یاد میرے دل میں یوں تیر رہی تھی جیسے پانی کی سطح پر تیرتا ہُوا کنول کا پھُول ہوا کے جھونکوں سے رقص کرنے لگے۔

جب میں چونکا تو چاروں طرف کچھ تاریکی سی تھی۔ کچھ اجالا سا تھا۔۔۔ یا یُوں کہ دونوں ملے جُلے سے!

نیا نیا نِکلا ہوا چاند یاسمین کی لہراتی ہُوئی ٹہنیوں سے جھانک رہا تھا۔ سُوکھی ہُوئی ٹہنیوں پر بے شمار نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہوا کے خنک جھونکوں میں عجیب سی خوشبو تھی۔۔۔ نامعلوم سی خوشبو! رات کی رانی اور شبّو کے پودے جھوم رہے تھے۔

آسمان پر ننھے مُنّے تاروں کا غبار تھا۔۔۔ ٹمٹماتے ہوئے تاروں کا دُھندلا سا غُبار۔ چاند کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بدلیاں تیر رہی تھیں۔

فوّارے کی ہلکی ترنّم خیز صدا کبھی کبھی سُنائی دے جاتی تھی۔

میں مُسکرانے لگا۔۔۔ عجیب سی مسرّت میرے دل میں کروٹیں لینے لگی۔ میں بالکل نئی فضا میں سانس لے رہا تھا۔

تب میں نے سوچا کہ یہ رنج و غم سب وقتی چیزیں ہیں۔ بالکل ناپائیدار! نہ تو خوشی ہی دیر تک رہتی ہے اور نہ اُداسی۔ بلکہ ایسی محبوب ہستیوں کی یاد ہمیشہ کے لیے دل میں محفوظ رہتی ہے اور ایسے مسرور لمحوں کی یاد بھی جو کبھی مُسکراہٹوں میں بسر ہوئے تھے۔ یہی یاد زندگی کی ویرانیوں میں رفیق بنتی ہے۔ سب کچھ اُجڑ جانے پر بھی زندگی کی تاریکیاں انہی کرنوں سے جگمگا اُٹھتی ہیں۔ یہ جھلمل جھلمل کرتی ہُوئی پیاری پیاری کرنیں۔۔۔!

# گرمیوں کی چھٹیاں

گرمیوں کی چھُٹیاں تھیں، میں کہیں جا رہا تھا۔ پورے دو روز کے سفر کے بعد منزلِ مقصُود، بلکہ اسٹیشن مقصود نزدیک آ رہا تھا۔ میں نے انگوٹھے اور اُنگلی سے اپنی ناک کو مروڑا (بہت سے حضرات کو یہ مرض ہے مگر مجھے نہیں) گھڑی دیکھی تو صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ جلدی سے "لندن لائف" کے پرچوں کو بیگ میں بند کیا۔ تولیے سے مُنہ کی گرد صاف کی اور چہرے پر مصنوعی مُسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

گاڑی رُک گئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کوئی واقف صورت نظر نہ آئی۔ خیر میں اُترا۔ انجن سے لیکر گارڈ کے ڈبے تک تلاش کی۔ مگر کوئی بھی صورت آشنا نہ مِلا۔ لا حول ولا، کتنے بُرے ہیں یہ لوگ۔ تین خط لکھے۔ ایک تار دیا۔ مگر کسی کو توفیق نہ ہُوئی کہ مجھے اسٹیشن پر لینے ہی آ جاتا۔ گھر کے بکھیڑوں سے کسے فرصت ملتی ہو گی۔ مگر اظہر کیوں نہیں آیا۔ مریل کہیں کا۔ کسی بند

کمرے میں بیٹھا ہو گا۔ موٹے موٹے شیشوں کی عینک ناک پر سوار ہو گی۔ سامنے کوئی ڈکشنری جتنی ضخیم کتاب کھلی ہو گی۔ پڑھ رہا ہو گا۔ میں نے سارا سامان ایک بنچ پر رکھوا دیا اور اپنے دل میں سوچا۔ کچھ بھی ہو بغیر استقبال کے کبھی نہیں جاؤں گا۔ اتنے سال کے بعد تو میں یہاں آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور وُہ اظہر۔۔۔ اُلّو کی دُم۔۔۔ شتر مُرغ۔۔۔ کھجور کا درخت۔۔۔ عمرو عیّار۔۔۔ بیدِ مجنوں۔ مجھے اُس کے بچپن کے سارے نام یاد آ گئے۔۔۔ اب تو خاصا بڑا ہو گیا ہو گا۔ میں نے دوبارہ مُڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ ایک شخص میری طرف آرہا تھا۔ افیمیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا۔۔۔ موٹے موٹے شیشوں کی بے ڈھنگی سی عینک آنکھوں پر چمک رہی تھی، بال پریشان، آنکھوں کے گرد حلقے، پچکے ہوئے گال، ایک مُردہ سی مُسکراہٹ لبوں پر، میں نے جھٹ پہچان لیا۔ یہ اظہر تھا۔ کم بخت کو جیسا چھوڑ کے گیا تھا ویسے کا ویسا ہی تھا۔ میں نے جان بوجھ کر مُنہ موڑ لیا۔ جیسے دیکھا ہی نہیں۔ کھٹ کھٹ کھٹ! وُہ بالکل میرے نزدیک آ گیا اور نہ معلوم دیوانے کو کیا سوجھی کہ دوڑ کر بینچ پر چڑھ گیا۔

"ادھر آیئے صاحب! آپ سے بغلگیر ہو لوں۔" میں آگے بڑھا اور وُہ مجھ سے چمٹ گیا۔

"ارے کتنا لمبا ہو گیا تُو۔ جبھی تو مجھے بنچ پر چڑھنا پڑا۔ آں ہاں یار اتنے زور سے مت بھینچ، کہیں ایک آدھ پسلی نہ توڑ دیجو۔ تیرا کیا ہے، تُو تو ہے جِن اور میں ٹھہرا بیچارہ۔۔۔!"

"چھلاوہ!" میں نے لقمہ دیا۔ "یاد ہے اپنا نام؟"

"مجھے تو بالکل یقین ہی نہیں آتا کہ اتنا لمبا ہو جائے گا۔ آخر کِس چکی کا پیسا کھاتا ہے۔ اِدھر ہم ہیں کہ موت کو تتو تمبو کر کے روک رکھا ہے۔ دوائیاں کھا کھا کر دن پُورے کر رہے ہیں۔"

"کیا حال ہے تیرے فلسفے کا؟ اور ہاں یار سُنا ہے تُو نے کہیں ہاتھ مارا ہے؟ ٹھیک ہے کیا؟؟"

"بس یہی سمجھ لے۔ اس مرتبہ ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ ورنہ شادی کبھی کی ہو چکی ہوتی، خیر اب اگلے سال سہی۔"

"ہت تیرے کی، ہمیشہ سے مرضوں کا گھر ہی رہا۔۔۔ کون ہے وُہ لڑکی؟"

"شاید تم نے دیکھی بھی ہو۔ بھئی وہی جو میری، یو، پی۔ والی رشتہ دار ہیں نا، اُن کی لڑکی۔۔۔ اپنے ساتھ ہی تو کھیلا کرتی تھی۔ بھُول بھی گئے اتنی جلدی؟"

"اب نام بھی بتاؤ گے اس یو، پی۔ والی رشتہ دار لڑکی کا؟"

"صُغرا۔"

"صُغرا؟ ابے احمق کیسے پھانس لیا اُسے۔ وہی نا جسے ہم نور جہاں کہا کرتے تھے۔ اب تو کافی نکھر گئی ہو گی۔۔۔ کتنے ہی سال ہوئے اُن باتوں کو۔"

"بس پوچھ مت یار، کبھی ہیرا دیکھا ہے؟ بس سمجھ لے کہ ہیرا ہے۔ اب تو سچ مچ نور جہاں ہے۔"

"پھر تو وہی معاملہ ہو گا۔۔۔ پہلوئے حور میں لنگور خُدا کی قدرت۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

"مگر بھئی! تجھ سے ڈر ہی لگتا ہے۔"

"ڈر کیسا؟"

"یاد ہے کہ جب وُہ نور جہاں بنتی تو تُو سلیم بنتا اور مجھے کبھی بیر بل بنا دیا جاتا، کبھی مُلّا دو پیازہ، جب تک تُو یہاں رہا، اُس نے کبھی مجھ سے سیدھے مُنہ بات نہ کی اور اب میں نے بڑی مشکلوں سے اُسے منایا ہے۔ کہیں تُو پھر بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دیجو۔۔۔ کیوں؟" وُہ ہنس پڑا۔

"باؤلا ہوا ہے۔۔۔!" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اُف مار ڈالا، توڑ دیا کندھا، یار تُو پرے ہی رہ!"

"اب گھر چلیں؟۔۔۔ کچھ ساتھ بھی لایا ہے؟"

"کار باہر کھڑی ہے۔"

"کہیں وہی چندر گپت کے زمانے کا رَتھ تو نہیں؟"

"نہیں جناب! بالکل نئی لی ہے۔ صُغرا کو کالج چھوڑنے جایا کرتا ہوں۔"

"خوب ٹھاٹھ ہیں پھر تو۔۔۔" ہم دونوں باہر آ گئے۔ کار واقعی بالکل نئی تھی۔

"کون سی سیٹ پر بیٹھا کرتی ہے وُہ؟ ساتھ بٹھاتا ہے کیا؟"

"ایسے نصیب کہاں؟ البتہ اگلے سال سے ساتھ ہی بیٹھا کرے گی۔ فی الحال تو پچھلی سیٹ پر بیٹھتی ہے۔"

کل دس منٹ کا راستہ تھا۔ ہم گھر پہنچ گئے۔ وہی اُونچا محراب دار دروازہ، بجری والی سڑک، لمبا چوڑا باغ، سرو کے خوبصورت درخت، پھولوں کے تختے، ایک ایک کر کے تمام چیزیں میری آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ گھر کا محلِ وقوع باشندے، حدودِ اربعہ۔۔۔ سب کچھ از سرِ نو یاد ہو گیا۔ ہم دونوں صحن میں پہنچے،

سامنے دالان میں کئی خواتین بیٹھی تھیں۔ کچھ بچّے اِدھر اُدھر جگالی کرتے ہوئے پھر رہے تھے۔ میں نے ایک نیم فرشی سلام کیا۔ اور پھر ہر ایک کو "خالہ امّاں سلام، پھوپھی امّاں سلام" وغیرہ کہا۔ سب نے مجھے حسبِ توفیق پیار کیا۔ صُغرا کی والدہ بولیں۔ "جیتے رہو بیٹا۔ اب تو پُورے جوان دکھائی دیتے ہو۔ توبہ توبہ کیسے بے مروّت ہو تُم لوگ۔ آخر ایسی کون سی ولایت میں رہتے ہو کہ جب سے پردیس میں نکلے۔ ادھر کا نام ہی بھول گئے۔ نگوڑا کیا منحوس تھاوُہ وقت جب سے تم لوگوں نے خانہ بدوشی شروع کی۔ سیلانی ہیں سیلانی، گھر میں تو ان کا قدم ہی نہیں ٹکتا۔ باہر کا پانی کچھ ایسا لگا ہے کہ بس وہیں کے ہو گئے ہیں۔ خُدا جانے اتنے برسوں کے بعد کیا خیال آیا کہ یہاں آ گئے۔ صُغرا نے سال بھر سے خط لکھنے شروع کئے۔ اُٹھتے بیٹھتے بس یہی ایک وظیفہ رہ گیا تھا۔ بھیّا کب آئیں گے؟ بھیّا کب آئیں گے؟ خدا کا شکر ہے۔ کسی کی تو محبّت ہے ان کے دل میں بھی۔ ارے صُغرا کہاں گئی؟۔۔۔ دیکھا کیسی عجیب لڑکی ہے؟ صُبح سے وُہ اودھم مچار کھا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ کبھی ٹائم ٹیبل دیکھا جا رہا ہے۔ کبھی نقشے بن رہے ہیں۔ نوکروں کو تاکید ہو رہی ہے کہ اس طرح کھڑے ہونا جھُک کر سلام کرنا۔ اچھی طرح لانا اور اب جب یہ آ گئے ہیں تو خُدا جانے کہاں جا چھپی ہے۔ ساتھ ہی تو کھیلی ہے کیوں میاں؟" میں نے سر ہلا دیا اور اظہر نے بھی تاکید کر دی۔

بچّوں کی چیزیں تقسیم کرنے اور سامان رکھنے میں کافی وقت صرف ہوا۔ اس کے بعد میں جلدی سے باغ کی طرف لپکا۔ میرا خیال تھا کہ صُغرا وہیں ہو گی۔

اور وُہ واقعی وہیں تھی۔ باغ کے وسط میں ایک چبوترے پر بیٹھی تھی۔ نیچی نظریں، وہی ہلکاہلکا گلابی چہرہ، دونوں طرف لچھے دار بال، سامنے میز پر کچھ رنگین کپڑے پڑے تھے۔ آپ سوئی لیے کچھ کاڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر مُسکرائیں۔ کپڑے ایک طرف رکھ دے اور اُٹھ کھڑی ہوئیں، غالباً یہی سوچا ہو گا کہ اب کیا کہا جائے، سلام تو بڑوں کو کرتے ہیں اور دُعا چھوٹوں کو، ادھر میں نے یہ سوچا تھا کہ کہوں گا نور جہاں بیگم آداب۔ مگر انہیں دیکھتے ہی کچھ مرعوب سا ہو گیا۔

"آپ اچھی تو ہیں؟"

"جی ہاں! اور آپ بھی خیریت سے آئے نا؟"

"بالکل خیریت سے آیا! تبھی تو یہاں پہنچ گیا۔ فقط اسٹیشن پر ذرا انتظار کرنا پڑا۔"

"یہاں سے تو ہم نے بھائی اظہر کو کافی دیر پہلے بھیج دیا تھا مگر اُنہیں راستے میں چھینک آ گئی ہو گی۔ اور کہیں فلسفے کا نظریہ سوچنے بیٹھ گئے ہوں گے۔ یا کہیں، کسی ڈاکٹر کے ہاں دوائی لینے رُک گئے ہوں گے۔" ہم دونوں ہنس پڑے۔ پھر باتیں

شروع ہوئیں۔ گھر کی سیاسیات، بیٹے ہوئے دِنوں کے قصّے، شکائتیں۔ آخر میں اظہر کا ذکر چھیڑا۔

"آج کل کیا مشغلہ ہے اِن کا؟" میں نے پُوچھا۔

"سارا دن کمرے میں بند رہنا، فلاسفی کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنا۔ دن میں بیسیوں مرتبہ طرح طرح کی دوائیاں پینا، کوئی قسمت کا مارا بچّہ ان کے کمرے میں چلا جائے تو غریب کی شامت آجاتی ہے۔ ایسے زور سے جھڑکتے ہیں کہ بس، اور دیر تک بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ کھانا بھی کبھی کبھار ساتھ کھاتے ہیں۔ ورنہ عموماً پرہیز کھانا ہوتا ہے اور کمرے میں جاتا ہے۔ کسی دن لاڈ میں آگئے تو سینما چلے گئے یا باہر سیر کو نکل گئے۔ واپس آتے ہیں تو کہیں سر پر بادام روغن ملا جارہا ہے میں مالش ہو رہی ہے اور جناب ہیں کہ پکار رہے ہیں۔ تھک گیا تھک گیا۔ گھر میں بیڈمنٹن بھی ہے اور ٹینس کا کورٹ بھی۔ مگر کیا مجال جو کبھی پاس پھٹک جائیں۔" اظہر کے بارے میں اُس کی منسوبہ کی زبان سے یہ باتیں سُن کر میں کچھ حیران سا رہ گیا۔ ویسے بھی کس قدر بے میل جوڑ تھا۔ کہاں اظہر جیسا دائمی المریض اور خشک انسان اور کہاں صُغرا جیسی شوخ لڑکی۔

شاید تیسرے روز کا ذکر ہے۔ سب بیٹھے تھے۔ میں نے سوال پیش کیا کہ مجھے ایک علیٰحدہ کمرہ دیا جائے۔ جس پر صُغرا کی والدہ بولیں۔

"علیٰحدہ کمرہ! لڑکے کسی سرائے میں ٹھہرا ہے یا مسافر خانے میں؟ کل کو یہ بھی کہہ دیجو کہ تجھے کرائے کا حساب بھی سمجھا دیں۔ پگلا کہیں کا۔ ویسے بھی تو خدا جانے دن بھر کہاں غائب رہتا ہے۔ سب کی نظریں دروازے پر رہتی ہیں۔ اب آیا، اب آیا۔ مگر انہیں بھی قسم ہے جو یہ جھانک بھی جائیں۔"

"جبھی تو کہہ رہا ہوں کہ کمرے میں سارے دن بیٹھا رہا کروں گا۔ دیکھئے نا، اگر سر میں تیل لگانا ہو تو ایک کمرے میں جاؤں، کنگھا کرنا ہو تو دوسرے میں، کپڑے بدلنے ہوں تو تیسرے میں۔ اسی اُلٹ سلٹ میں میری اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔" انہوں نے ایک ہلکا سا تھپڑ میرے گال پر دے مارا۔

"بالکل ویسے کا ویسا ہے۔ وہی بھولا پن، وہی شوخی، ہم تو سمجھے تھے کچھ سیانا ہو کر آئے گا۔ مگر وہی باتیں ہیں۔ اظہر ہی کو دیکھ لو، کہ اتنے سے دنوں میں کتنا بدل گیا ہے۔"

اگلے روز شام کو میں اور صُغرا صحن میں کھڑے تھے۔ وُہ مجھے کمرے دکھا رہی تھی۔

"ایک کمرہ تو ابّا جان کے کمرے کے ساتھ ہے اور دوسرا میرے کمرے کے پچھواڑے ہے۔ بتایئے کون سا لیں گے آپ؟"

"ان میں سے مجھے کوئی بھی پسند نہیں۔"

"وُہ کیوں؟"

"پہلا کمرہ کیوں ناپسند ہے۔ اس کی وجہ آپ کو بھی معلوم ہے، اور مجھے بھی۔ اب رہا دوسرا کمرہ۔ سو عرض ہے کہ نہ تو مجھے زکام ہی پیارا ہے اور نہ نزلے سے لگاؤ ہے۔ آپ کے کمرے سے دُنیا بھر کی خوشبوؤں کی لپٹیں آیا کریں گی۔ میرا یہ حال ہے کہ جہاں کوئی تیز سی خوشبو سُونگھی، کھٹ سے نزلہ ہو گیا۔"

وُہ ہنس پڑی اور بات بھی سچ تھی۔ اس وقت بھی اس کے کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

"ایک کمرہ اور ہے مگر وُہ ہے ذرا خطرناک جگہ۔ ایک طرف بچّے کھیلتے ہیں اور دوسری طرف آسیب زدہ کمرہ ہے۔"

"تو پھر تو میں وہاں ضرور رہوں گا۔ بھلا ایسی دلچسپ جگہ کون چھوڑ سکتا ہے۔ مگر وہ آسیب ہے کیا؟"

"آسیب وُہ ہے جو آپ کو اسٹیشن پر لینے گیا تھا اور جو بچّے ہیں وُہ ایسے شریر ہیں کہ خُدا کی پناہ۔ سارا دن اُدھم مچائے رکھتے ہیں۔"

"اچھا تو آپ کا مطلب ہے اظہر ہے۔ بھلا اس کا کمرہ آسیب زدہ کیسے ہو گیا؟"

"یہ کمرہ اُٹھ پہر بند رہتا ہے اور اس میں بھائی اظہر مقید رہتے ہیں۔ اس میں سے طرح طرح کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ کبھی کوئی بہت سی وزنی چیزیں اِدھر اُدھر گھسیٹ رہا ہے۔ کبھی سسکیاں سُنائی دیتی ہیں۔ کبھی یک لخت کوئی ہنسنے لگتا ہے۔ پھر گانے سُنائی دیتے ہیں۔ جیسے کوئی موسیقی کی گردن پر کُند چھُری پھیر رہا ہو۔ کبھی یک لخت قہقہے سُنائی دیتے ہیں۔ شام کو کمرے میں اندھیرا ہوتا ہے اور رات کو ذرا ذرا سی دیر میں روشنی ہو جاتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے۔ خدا جانے اندر کیا ہوتا ہے۔ بھائی اظہر کمرے سے بڑے سنجیدہ بن کر نکلتے ہیں۔ ناک چڑھی ہُوئی ہے۔ بھنویں تنی ہُوئی ہیں۔ چل کہیں رہے ہیں قدم کہیں پڑتے ہیں۔ دراصل فلاسفی نے اُن کا دماغ اُلٹ دیا ہے۔ اگر کچھ روز یہی حالت رہی تو نہ معلوم کیا بن کر رہیں گے۔ یہ تو آپ کے آنے سے چہل پہل سی نظر آتی ہے اور بسورتے ہوئے ہونٹوں پر کبھی کبھار مُسکراہٹ بھی آ جاتی ہے۔"

"آپا چاند۔۔۔وُہ رہا۔۔۔۔۔ آؤ تو سہی آپا!" ننّھا چھت سے چلّایا۔ ہم نے اس کی طرف دیکھا اور کوئی خیال نہ کیا۔

"کیسا صاف نظر آرہا ہے بھیّا! اُوپر تو آؤ۔" وُہ پھر چلّایا۔

"سُن لیا ہے!" صُغرا بولی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ گویا پوچھتی تھی۔

"دیکھیں کیا؟"

ہم دونوں سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ حالانکہ چاند دیکھنے کا نہ تو مجھے شوق تھا اور نہ ہی غالباً اُسے ہو گا۔ اور چاند بھی یونہی کسی معمولی سے مہینے کا تھا۔ عید کا چاند ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ وُہ ایک سیڑھی پر رُک گئی۔ ہم دونوں چاند کی تلاش میں تھے۔

"وُہ دیکھیے نظر آیا آپ کو؟" اُس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مجھے چاند تو نظر آ گیا۔ پتلا پتلا باریک سا چمک رہا تھا۔ میں نے یونہی شرارتاً کہا۔

"کہاں ہے بھلا؟"

اُس نے پھر انگلی سے اشارہ کیا۔ میں نے پھر اس طرح مُنہ بنایا جیسے کچھ نظر نہیں آیا۔

"یہاں آیئے" وُہ بولی۔ میں ایک سیڑھی چڑھ کر اس کے برابر جا کھڑا ہوا۔

"وُہ دیکھئے! اس مینارے کی بالکل سیدھ میں۔۔۔ وُہ چھوٹی سی بدلی ہے۔ اُس کے اُوپر وُہ رہا۔"

"آپ اس طرح جھک کر دیکھئے۔ بالکل میرے ہاتھ کی سیدھ میں۔" میرا رخسار اُس کے شانے سے چھو رہا تھا۔ شانے سے کیا بلکہ ایک ملائم اور معطّر دوپٹے سے لگا ہوا تھا۔

"مجھے نظر آ گیا! پہلی رات کا ہے شاید۔"

"ہاں پہلی رات کا ہے۔ وُہ بولی۔ اور اس کے ساتھ ایک تارہ بھی تو چمک رہا ہے۔ کیسا چمکیلا اور پیارا پیارا ہے۔"

"آپ کے بندے اس تارے سے کہیں زیادہ چمکیلے اور پیارے ہیں۔" میں نے اس کے بندے سے کھیلتے ہوئے کہا۔

اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔۔۔ بالکل نزدیک سے۔۔۔۔ میرے سامنے دو کٹورے سی آنکھیں تھیں۔ جو مجھے عالمِ حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا

کے جھونکے آ رہے تھے۔ اُس کی زُلفیں رہ رہ کر میرے چہرے سے چھُو جاتی تھیں۔

اُس نے دفعتاً گردن جھکالی۔ اور ایک طرف کو ہو گئی۔ ہم دونوں نیچے اُترنے لگے۔ دالان میں اظہر کھڑا تھا اور ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ صُغرا ایک طرف چلی گئی۔ میں دوسری طرف۔ معمولی سے بات تھی۔ محض اتفاق تھا۔ صُغرا کی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب کچھ سوچنا حماقت تھی۔

اگلی صُبح میں باہر جاتا ہوا باغ میں سے گزرا۔ وہاں صُغرا بیٹھی تھی۔ لمبی لمبی سفید انگلیاں ایک کپڑے پر حرکت کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی کُرسی پر ننّھا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر حسبِ معمول مُسکرائی اور بولی۔

"سُنا آپ نے یہ ننّھا کیا کہہ رہا تھا؟"

"شکایت کر رہا ہو گا میری۔۔۔ کہ کہیں باہر ساتھ نہیں لے جاتے۔"

"جی نہیں۔ تعریفیں کر رہا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ بھیّا بہت اچھے ہیں۔ بڑے پیارے لگتے ہیں۔ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ جب سے یہاں آئے ہیں ہمارا جی بہل گیا ہے۔ اور بھائی اظہر تو ہمیں زہر دکھائی دیتے ہیں۔ بات کرنا تو کہاں، یونہی مارے گھرکیوں کے دم ہی تو نکال دیتے ہیں۔"

"نہیں نہیں ننّھے۔ کہیں بڑوں کی شکایت بھی کیا کرتے ہیں۔ میرا کیا ہے۔ اوّل تو میں ایسا ہوں ہی نہیں جیسا تم نے سمجھ رکھا ہے اور پھر میں آیا بھی تو چند دنوں کے لیے ہُوں۔ بھائی اظہر تو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔"

"میں نے تو کہا تھا۔" صُغرا بولی۔ "مگر یہ کہنے لگا کہ اگر بھیّا یہاں رہ جائیں تو کیا ہو؟ بھائی اظہر سے تو یہ لاکھ درجہ اچھّے ہیں۔ سب کے سب انہیں پیار کرتے ہیں۔ اگر ہمارے بس میں ہو تو انہیں یہیں رکھ لیں۔ ہمیشہ کے لیے۔"

میں ہنس پڑا۔ وُہ بھی ہنسی اور ننّھے کے گال پر انگلی رکھ کر بولی۔

"لو میاں ہم نے تمہارے دل کی بات تو ان تک پہنچا دی ہے۔ خدا جانے انہیں بھی تمہاری محبّت ہے یا نہیں؟" میں نے ننّھے کو گود میں اُٹھالیا۔۔۔

اس کے بعد میں کافی دیر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ کہیں اپنے دل کی بات تو ننّھے کی زبانی نہیں کہہ رہی تھی؟ نجانے ننھے کو ان باتوں کا کیا پتہ؟ پھر اظہر کی برائیاں، میری خوبیاں، ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤں۔ یہ صُغرا نہیں بول رہی تھی تو اور کون تھا؟

مگر اظہر۔۔۔ شاید اسے بے چارے کو اس بات کا علم بھی نہ ہو کہ صُغرا کو اس سے نفرت ہے اور اس کشیدگی کو شاید وُہ پیار سے تعبیر کرتا رہا ہو۔ پھر یکایک خیال آیا

کہ کہاں کا اظہر اور کیسی دوستی؟ بھلا زندگی میں ایسے موقعے کہیں روز روز آیا کرتے ہیں؟ یہاں سب کے سب میرا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اگر معمولی سی کوشش بھی ہو تو صُغرا ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے اور اظہر میاں رہ جائیں مُنہ دیکھتے۔ اور پھر اظہر بھی کوئی آدمی ہے؟ مُردہ کہیں کا۔ کوئی بھی جاذبیت نہیں۔

اُدھر صُغرا ہے کہ ایک دفعہ نظریں چہرے پر پڑ جائیں تو ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔۔۔ میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا۔

اسی شام کو کھیل کر واپس آیا۔ کمرے میں پہنچا۔ چونکہ کافی پہلے آ گیا تھا اس لئے جی نہ لگا۔ کپڑے بدلے اور باہر جانے کی ٹھان لی۔ جی میں آیا کیوں نہ مکان کے پچھواڑے سے چلیں۔ وہاں انار کے بہت سے درخت تھے۔ وہاں پہنچا تو ایک عجیب تماشا دیکھا۔ دو بچّے مُنہ پھُلائے کھڑے تھے اور ایک انار کے سوکھے سے درخت میں کوئی اُلجھا ہُوا تھا۔ دیکھا تو صُغرا تھی۔ پہلے تو خیال آیا شاید بچّوں کے لیے انار توڑ رہی ہو گی مگر وُہ درخت تو بالکل سوکھا ہُوا تھا۔ پاس پہنچ کر معلوم ہوا کہ صُغرا بچّوں کی گیند نکالنے کی کوشش میں درخت میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ کم بخت، سوکھی ٹہنیاں، چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے۔۔ ایک دوپٹہ ہی بیسیوں جگہ سے اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے ٹہنیاں اُونچی کرنی چاہیں۔

مگر اس کے گرد تو ایک جال سا بُنا ہُوا تھا۔ اب میں نے دونوں ہاتھوں سے کھینچا تانی شروع کر دی۔ کانٹے ایسے چُبھے کہ مزا ہی آ گیا۔ ایک ناک پر لگتا ہے تو دوسرا کمر کو چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنے میں چٹاخ سے ایک سوکھی ہُوئی ٹہنی میرے مُنہ پر لگتی ہے۔ اتفاق سے میری بانہیں کھلی تھیں۔ جگہ جگہ گل کاری سی ہو گئی۔ ذرا سی دیر میں صُغرا تو باہر نکل آئی مگر مجھے تھوڑی دیر اور دھینگا مُشتی کرنی پڑی۔ میرے بازو اچھی طرح سے رنگے گئے۔

"افّوہ! کتنا خون نکل آیا؟ یہ سب اِن شیطانوں کی وجہ سے ہوا۔" اس نے بچّوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو فوراً وہاں سے اُڑنچھو ہو گئے۔

"آپ ان کھُردرے ہاتھوں پر ناحق اپنا رومال خراب کر رہی ہیں۔"

"کتنے اچھے ہاتھ ہیں۔ خواہ مخواہ چھِل گئے بے چارے۔" وُہ رومال میرے ہاتھ پر پھیر رہی تھی اور میں اُس کی لمبی لمبی پلکیں دیکھ رہا تھا۔ یکایک میری نگاہ گلاب کے تختے کی طرف جا پڑی۔ موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے دو پژمردہ آنکھیں ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔ چہرے پر مُردنی چھائی ہُوئی تھی۔

"شکریہ! دیکھئے نا بالکل صاف ہو گیا یہ ہاتھ۔ میرا مطلب ہے" میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اظہر کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔

سوائے اس کے کہ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں اور وُہ کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔ اظہر کا اندیشہ پورا ہو کر رہا۔ اُسے جس بات کا ڈر تھا وہی ہُو کر رہی۔ صُغرا سے باتیں کرتے ہوئے بعض اوقات تو میں بالکل ہی بھُول جاتا کہ اس کی منگنی اظہر کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔

اظہر اب مجھ سے کترانے لگا۔ باہر بھی میں اکیلا ہی جاتا۔ اور جب میں اُسے بُلاتا تو وُہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال مٹول کر دیتا۔ مگر مجھے تعجّب اس بات پر تھا کہ محض دس بارہ روز میں یہ سب کچھ کیونکر ہو گیا۔ وُہ بیچارہ روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں۔ اس کا زیادہ وقت کمرے میں گزرتا تھا۔ آنکھیں ہر وقت سُرخ رہتی تھیں جیسے ساری رات جاگتا ہو۔ اور یا ابھی ابھی رو کر آیا ہو۔

انہی دنوں صُغرا کی خالہ کے ہاں ایک شادی کی ہڑبونگ پیش آئی۔ ان کی خالہ نزدیک ہی ایک قصبہ میں رہتی تھیں۔ بہت بڑی جائیداد کی مالک تھیں۔ شادی پر سارے کُنبے کا جانا ضروری تھا۔ چنانچہ ہم سب کے سب وہاں گئے۔ بڑے بڑے باغ، کھلے کھیت، چمکتی ہوئی ندیاں، چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ہم

لوگ گویا بہشت میں پہنچ گئے۔ صُبح سے شام تک وُہ دھما چوکڑی مچتی کہ خُدا کی پناہ۔ چھوٹے تو خیر تھے ہی شریر، بڑے بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل جاتے۔ ایک رات اُن کو سوجھی کہ باغ میں آنکھ مچولی کھیلی جائے اور لطف یہ کہ اس میں نہ صرف بچّے ہی شریک تھے، بلکہ بڑے بھی بچّے بنے ہوئے تھے۔ میں ذرا ہچکچایا۔ جس پر ایک تیز جواب ملا۔ ”کیوں نہیں کھیلو گے؟ بڑے ہو گئے ہو؟ لو اور سُنو۔ شاید سینگ نکل آئے ہیں میاں کو۔ ہماری نظروں میں تو ابھی بچّے ہی ہو۔“

میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ایک طرف سے گھٹا آ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ برسے گا۔

”جب برسے گا دیکھا جائے گا۔ ابھی کھیلو تو سہی۔“ خیر سب کھیلنے لگے۔ وُہ کم بخت باغ بھی پورا بن کا بن تھا۔ جو کہیں اِدھر اُدھر چھُپ جائے۔ اس کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ میری شامت جو آئی تو اندھا دُھند بھاگا۔ ایک بچّے نے جھٹ سے پکڑ لیا۔ اب میری باری آئی بہتیرا اِدھر اُدھر پھرا کہ کوئی ہاتھ آ جائے مگر بے سود، آخر ایک سائے کے پیچھے بھاگا۔ درختوں میں سے ہوتا ہوا۔ پھولوں کو

روندتا ہوا۔ اُسی سائے کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ آخر کافی لمبی دوڑ کے بعد میں نے اُسے پکڑ لیا۔۔ اب جو دیکھتا ہوں تو حیران ہو گیا۔ یہ صُغرا تھی۔

"میں سمجھا کوئی اور ہو گا۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"مگر مجھے تو پتہ تھا کہ آپ ہی ہیں۔" اُس کا سانس پھُولا ہوا تھا۔ ہم دونوں لوٹنے لگے۔

"ہم کس طرف آ گئے آخر؟" وُہ بولی۔ میں بھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ چودھویں کا چاند ابھی ابھی نِکلا تھا۔ اس لئے روشنی کچھ پھیکی سی تھی۔

"دیکھیے اُمید تو ہے کہ گھر ہی پہنچیں گے۔" میں نے کہا۔ دراصل مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں۔

کچھ دور گئے ہوں گے کہ نہایت لطیف خوشبو آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم گھر کے آس پاس ہی کہیں تھے۔ کیونکہ گھر کے چاروں طرف خوشبودار پھولوں کے لاتعداد پودے لگے تھے۔

"ارے یہ کیا؟" وُہ رُک گئی۔

سامنے ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ بالکل معمولی سا شاید باغ میں پانی دینے کے لیے ہو گا۔ میں بڑی آسانی سے اسے پھلانگ گیا۔ مگر صُغرا جھجک کر رہ گئی۔ ویسے بھی لڑکیاں لانگ جمپ تو کرنے سے رہیں۔ اُس نے جوتے اُتار کر پائنچے سنبھالے اور پانی میں پیر رکھنے ہی لگی تھی کہ پھر رُک گئی۔ شاید اُسے گہرائی کا خیال آ گیا ہو۔ کچھ دیر سُوچتی رہی پھر میری جانب دیکھا کہ اب کیا کیا جائے۔

"اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو واپس چلیں اور کسی ایسے راستے سے گھر چلیں جہاں یہ نالہ نہ آئے اور یا یہ کہ آپ ہمّت کر کے نالے کو کود جائیں۔" مجھے اس تجویز پر دل ہی دل میں ہنسی آ رہی تھی۔

"اب واپس جانے سے تو رہے۔ گھٹا آ رہی تھی، کیا پتہ کسی وقت برسنے لگے اور بھیگ جائیں۔ باقی رہا کودنا، سو نہ میں نے کبھی ایسی حرکت کی ہے اور نہ اب ہمّت پڑتی ہے۔"

"اچھا تو میں اس کنارے سے جھُک کر ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ آپ میرے ہاتھ کو پکڑ لیجئے۔ کچھ اس کا سہارا ہو گا اور آپ کوشش کریں گی۔ بس جھپکتے ہی آپ اس کنارے پر ہوں گی۔" خاصی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر وُہ مان گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مگر جب چھلانگ لگائی تو کچھ ڈر سی

گئی۔ اس کے قدم رُک گئے۔ میں اُسے سنبھالنے کے لیے جھُکا۔ مجھے توازن رکھنا مشکل ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وُہ ایک لمحے کے لیے میرے بازوؤں میں آ گئی۔ اس کا سر میرے سینے سے آ لگا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی کنول کے پھُول کو سنبھالا ہوا ہو۔

"توبہ توبہ! میں تو گر ہی پڑی تھی۔"

"دراصل میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ قصور میرا ہی ہے۔" ہم دونوں ہنس پڑے۔ چاندنی پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔ چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے برابر چل رہے تھے۔ ایسا جی چاہتا تھا کہ بس چلتے رہیں ہمیشہ یونہی چلتے رہیں۔ کہیں منزل نہ آئے۔ اسی طرح دن بیت جائیں۔

ذرا سی دُور گئے ہوں گے کہ چاند پر دُھند سی چھا گئی۔ یہ ایک بدلی تھی۔ ٹپ سے ایک بوند میری ناک پر گری۔۔۔ دوسری۔۔۔ تیسری۔۔۔ بوندوں کا تانتا بندھ گیا۔

"یہ کیا ہونے لگا، اب تو بھیگ جائیں گے۔" وُہ بولی۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ گھٹا آ رہی ہے۔ مت کھیلو، مگر کسی نے سُنا بھی ہو۔" ذرا سی دیر میں اچھی خاصی بارش شروع ہو گئی۔ ہم دونوں ایک گھنے درخت کے

نیچے کھڑے تھے۔ میں تو اُسے دیکھ رہا تھا۔ مگر وُہ نہ جانے کِس طرف دیکھ رہی تھی۔ بجلی زور سے چمکی اور میں نے دیکھا کہ اُس کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑی ہُوئی تھیں۔۔ ایک عجیب احساس میرے دل میں پیدا ہوا۔

جی نہیں چاہتا تھا کہ بارش تھمے۔ مگر آرزو پوری نہ ہوئی۔ چاند نکل آیا۔ پہلے سے کہیں چمک دار اور خوبصورت، سارے درخت اور پودے دُھل گئے ۔۔۔۔ جب ہم گھر کے نزدیک پہنچے تو رات کی رانی کی مہک نے مدہوش سا کر دیا۔ جلد ہی ہم گھر پہنچ گئے۔ کسی کو ہمارا خیال تک نہیں تھا۔ جہاں کئی درجن بچّے اور بے شمار بڑے جمع ہوں، وہاں کیا پتہ لگتا ہے کہ کون کہاں ہے۔ البتہ اظہر ہمیں ضرور ملا۔ وُہ دروازے پر کھڑا تھا۔۔ معلوم ہوتا تھا کہ کافی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں واپس آتے دیکھتے ہی اندر چلا گیا۔

ہم وہاں کوئی چار پانچ روز اور رہے ہوں گے۔ ان دنوں میں کوئی خاص بات نہیں ہُوئی۔ سوائے اس کے کہ ایک روز میں نے صُبح صُبح کئی رنگ کے پھُول اکٹھے کئے اور ہار بنانے لگا۔ اتنے میں صُغرا آگئی۔ بولی۔ ”یہ کس لئے بن رہے ہیں؟“ میں سوچنے ہی لگا تھا کہ کیا کہوں؟ پھر خود ہی پوچھا۔ ”کیا میرے لیے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔“

"تو لا یئے پہنا دیجئے"۔

میں نے ایک ہار تو اُس کے گلے میں ڈال دیا اور دو گجرے اس کی کلائیوں پر باندھ دیئے۔ محض اتنی سی دیر میں نہ صرف دل دھڑکتے دھڑکتے پاگل ہو گیا بلکہ ایسی ٹھنڈی صُبح میں پسینہ بھی آ گیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایک لڑکی اگر کسی سے کہے کہ ہار پہنا دو تو اُس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے صُغرا کی حالت پر ترس آنے لگا۔ اتنی اچھی لڑکی کیسے لڑکے سے منسوب ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ وُہ آپس میں رشتہ دار ہیں اور اُن کی نسبت بچپن ہی سے ٹھہری ہوئی ہے۔ اس وقت سے جب کہ شاید ان دونوں کو پتہ بھی نہیں تھا۔ کہ نسبت کہتے کسے ہیں۔

صُغرا نے جب سے ہوش سنبھالا اُسے اپنی دُنیا میں محض ایک ہی شخص دکھائی دیا اور وُہ اظہر تھا، جسے وُہ ناپسند کرتی تھی۔ اُس کی اُمنگوں کو کبھی پنپنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس حالت میں میری موجودگی میں جو کچھ ہوا اس کا نہ ذمہ دار میں تھا اور نہ صُغرا۔

جس روز ہم گھر لوٹے، کافی گرمی تھی۔ رات کو حبس ہو گیا۔ نیند ہی نہ آتی تھی، بڑی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی دو بجے کا عمل ہو گا۔ میں نے اُٹھ کر پانی پیا، واپس بستر پر جانے کو تھا کہ اظہر کے کمرے میں روشنی نظر آئی۔ اس کے

پلنگ کو دیکھا۔ وُہ بھی خالی تھا۔ مجھے تشویش سی ہُوئی۔ آہستہ آہستہ اُس کے کمرے تک پہنچا اور کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ اظہر ایک کُرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ غالباً کوئی تصویر تھی۔ وُہ رو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے ہی اس نے زور سے سُسکی لی اور سر میز پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر اس قدر کرب اور بے چینی تھی کہ اب تک میری آنکھوں کے سامنے اس کی شکل پھر رہی ہے۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ خدا جانے مجھے کیا سوجھی کہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ وُہ مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"بھئی کیا بات ہے اب تک نہیں سوئے؟"

"کچھ بھی نہیں یونہی پڑھ رہا تھا۔" اس کی نظریں فرش پر گڑی تھیں۔ وُہ تصویر کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں نے تصویر دیکھ ہی لی۔ یہ تصویر صُغرا کی تھی۔

"فلاسفی پڑھ رہے تھے کیا؟ بھئی، میری مانو تو فلاسفی نہ پڑھا کرو۔"

"بہت اچھا اب نہیں پڑھا کروں گا، شاید اب کچھ بھی نہیں پڑھوں گا۔" اس کے آنسو پھر نکل آئے۔

"مگر اظہر۔۔۔ مجھ سے چھپاتے کیوں ہو، بتا کیوں نہیں دیتے۔ آخر وُہ کون سی بے چینی ہے جو تم پر سوار ہے؟"

"کیا کروگے پوچھ کر؟" اس نے اپنی ڈراؤنی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اس دفعہ اس نے آنسو نہیں پونچھے۔

"شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

"مدد کرو گے؟ تم واقعی مدد کرو گے؟ اچھا تو بتاتا ہُوں۔ سُن رہے ہو؟ اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے۔ تاکہ مجھے اس مصیبت سے نجات ملے، جہاں میرا سب کچھ لے لیا وہاں یہ حقیر زندگی بھی چھین لو۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔۔ دیکھتے کیا ہوا۔" وُہ بری طرح کانپ رہا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو اظہر؟ دیوانے تو نہیں ہو گئے؟"

"ہاں میں دیوانہ ہی ہُوں۔ بہت دنوں سے دیوانہ ہوں۔ شُکر ہے تُم سیانے ہو۔ تم مجھ سے ہر لحاظ سے اچھّے ہو۔ تمہاری شکل بھی مجھ سے اچھّی ہے۔ ہے۔ تُم مجھ سے لمبے ہو۔ تُم ہر وقت ہنستے رہتے ہو؟ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟؟"

میں چُپ تھا۔ اس نے زور سے میرے بازو پکڑ لیے۔

"میں تم سے نفرت کرتا ہُوں۔ میرے دل میں جتنی تمہاری عزّت تھی، اتنی ہی اب نفرت ہے۔ تم نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میری زندگی میں جو بھی دلچسپی تھی۔ وُہ تم نے ملیامیٹ کر ڈالی۔ تم نے میرے خواب چکنا چُور کر دیئے۔ گھر میں سب کے سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔۔۔ بچّے تک مجھ پر ہنستے ہیں۔ لوگ مجھ پر آوازے کستے ہیں۔ مجھے ذلیل سمجھتے ہیں۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔ مگر میرا ایک سہارا تھا جس کے بھروسے پر میں جی رہا تھا۔ وُہ صُغرا تھی۔ تم نے اُسے بھی مجھ سے چھین لیا۔ اب میری زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ تُم یہاں آئے کیوں تھے آخر؟ شاید یہی ضروری کام کرنے آئے تھے تم!۔ شکر ہے کہ یہ کام تم نے کر دیا۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔۔۔ تُم۔۔۔!" اس کی انگلیاں میرے بازوؤں میں گھستی جارہی تھیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کی مُردہ اُنگلیوں میں اتنی قوّت ہو گی۔

وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ اُنگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ ڈھانپ لیا اور کُرسی پر بیٹھ گیا۔

مجھے اس پر کافی ترس آرہا تھا!

وُہ کافی دیر تک روتا رہا، پھر اُٹھا۔۔ میری طرف لڑکھڑاتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"بھیّا مجھے معاف کر دو، نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے؟ دیوانگی میں جانے تمھیں کیا کیا کہہ گیا۔ تمھیں بُرا تو نہیں لگا؟ ضرور لگا ہو گا۔ مجھے معاف کر دو گے نا۔۔۔ میں پاگل ہوں میرا دماغ ٹھکانے نہیں۔ میرے اچھّے بھائی۔۔۔ میری باتوں کا خیال تو نہیں کرو گے؟"

وُہ رو رہا تھا۔۔۔ میں خاموش کھڑا تھا۔۔۔۔ شاید کچھ آنسو میری آنکھوں سے بھی نکل آئے۔

اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کہ میں کب وہاں سے واپس آیا۔ وُہ ساری رات میں نے بیٹھ کر گزار دی۔ کوئی چیز ساری رات دل میں چُٹکیاں لیتی رہی۔

میں نے ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا سُنی تھی۔ ایک ایسے انسان کی زبانی جس کی تمناؤں کے کھنڈر پر میں نے اپنی اُمّیدوں کے محل کی بنیاد رکھنی چاہی تھی۔ دُنیا میں بہت سے ایسے انسان ہیں۔ جنہیں اپنی عمر میں بہت تھوڑی محبّت ملتی ہے۔ یہاں تک کہ بہتوں کو عمر بھر ایک پیار بھرا بول تک نصیب نہیں ہوتا۔ اگر ایسے انسان کو محبّت کا کچھ حصّہ کہیں سے مل جائے تو وُہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور

اُس کے لیے وُہ جان تک دے دیتا ہے۔ اظہر ان ہی میں سے ایک تھا۔ اس کا بے رونق، اور بے نُور آنکھیں میرے سامنے پھر رہی تھیں۔ خدا جانے اُس نے کیسے کیسے منصوبے باندھے ہوں گے؟ مستقبل کے کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے؟ کیا کیا اُمنگیں اُس کے دل میں ناچ رہی ہوں گی؟ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے بڑا زبردست گناہ کیا ہو؟ ایک بنے بنائے کھیل کو یُونہی بگاڑ دیا ہو۔ ساری رات عجیب کش مکش میں گزری۔ ایک طرف تو صُغرا کا پیارا چہرہ اور اُس کی پیاری پیاری باتیں تھیں اور دوسری طرف ایک دُنیا کے ٹھکرائے ہوئے انسان کی التجا تھی اور ساتھ ہی ایک خاندان دوست کی روایت۔

صُبح تک میں نے فیصلہ کر لیا۔۔ یہی کہ میرا چلا جانا ہی بہتر ہے۔۔ میرا کیا ہے؟ پہلے ہی بالکل بے پروا اور خبطی سا ہُوں۔ جس کی زندگی کا نہ تو کوئی اُصول ہے اور نہ ہی کوئی مقصد، میری کیا خوشی اور کیا غم۔ صُغرا میرے لئے تھی ہی نہیں۔ اس کی قسمت تو اظہر کے ہاتھوں کبھی کی سونپ دی گئی ہے۔ اس کی محبّت؟ مگر محبّت تو ابھی پنپ رہی تھی۔ ننّھا سا پودا ہی تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی ہی اُسے جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے کافی تھی۔ کسی چیز کا بنانا بڑا مشکل ہے اور بگاڑنا؟ بگاڑنا نہایت ہی آسان ہے۔ محبّت کے پیدا ہونے میں دیر لگتی ہے۔ مگر نفرت کے پیدا ہونے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ پہلی چیز جتنی مشکل ہے۔ دوسری چیز اتنی ہی آسان۔

دوسرے روز سے میں نے نہ معلوم کیا کیا جتن کئے۔ گمنام خطوط لکھے۔ لڑکیوں کی تصویریں، اُن کی تحریریں، مصنوعی تحائف، صُغرا سے انتہائی بے رُخی۔ جو کچھ بھی میں کر سکتا تھا، کیا۔ آخر کار حسبِ منشاء نتیجہ نکلا اور صُغرا مجھ سے بد گمان ہو گئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ میں اب تک اُس سے کھیلتا رہا ہوں۔

چند ہی دنوں میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ اگلے روز میں واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سارا کُنبہ زور لگا چکا۔ سب نے مجبور کیا۔ مگر میں ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوا۔ بیگ میں کپڑے رکھ رہا تھا کہ دروازہ کھُلا اور صُغرا اندر آئی۔ اس کا رنگ کچھ پھیکا پھیکا سا نظر آرہا تھا۔ خُدا جانے وُہ ایسا ہی تھا۔ یا مجھے خاص طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی برس رہی تھی۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"تو آج آپ ضرور جائیں گے؟" اس نے مُنہ پھیر کر پُوچھا۔

"جی ہاں۔"

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ دو مہینے ٹھہریں گے۔۔۔ ابھی تو ایک ہی مہینہ ہوا ہے۔"

"جی ہاں۔ ارادہ تو ایسا ہی تھا مگر اب جانا ہی پڑے گا۔ چند ضروری کام نکل آتے ہیں۔"

وُہ کچھ دیر بالکل خاموش رہی۔ پھر دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ بہت دُکھ پہنچاتے ہیں۔ آپ کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔ دیکھ لینا آپ کسی کے بھی نہیں ہوں گے۔ آپ سے تو بھائی اظہر ہزار درجہ اچھّے ہیں۔ وُہ جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہی باطن میں بھی ہیں۔ نہ انہیں اُلٹی سیدھی باتیں بنانی آتی ہیں۔ نہ وُہ جھُوٹ بولتے ہیں۔'' اس نے اپنی مُٹھّی کھول دی۔ کچھ خشک اور پژمُردہ پھُول فرش پر گر پڑے۔ یہ وہی ہار تھا جو میں نے اُس دن اُسے پہنایا تھا۔ وُہ چلی گئی۔

مجھے کُرسی کا سہارا لینا پڑا۔ سر جھکائے کچھ دیر بیٹھا رہا۔ چلتے وقت سب کے سب ملے۔ سوائے صُغرا کے جو سر کے درد کا بہانہ کر کے نہ معلوم کہاں جا چھپی تھی۔ اظہر مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ چمک تھی۔ شاید یہ خوشی کی چمک تھی۔ چلتے وقت اُس نے پھر معافی مانگی۔ میں اُسے بنچ تک لے گیا۔ وُہ بنچ پر چڑھ گیا۔ ہم دونوں خوب ہنس ہنس کر ملے۔ میں گاڑی میں سوار ہو گیا۔ جہاں تک وُہ مجھے نظر آتا رہا میں رومال ہلاتا رہا۔ پھر میں نے بیگ کھولا اور ''لندن لائف'' کے پرچے باہر نکالے اور کھڑکی سے باہر سیر دیکھنے لگا۔ یکایک میری نگاہیں ایک جگہ جا کر رُک گئیں۔ جہاں آسمان کی نیلاہٹ شفق کی سُرخی سے ملتی تھی۔ وہاں ایک پتلا سا چاند چمک رہا تھا۔ نہ جانے مجھے کیا خیال آیا۔ میرا دل بھر آیا، شاید میں نے ایک زبردست غلطی حماقت کی تھی۔ نہ جانے اپنی زندگی میں

کتنی حماقتیں کی ہوں گی۔ مجھ جیسے انسان کی زندگی بھی بذاتِ خود ایک حماقت ہی ہے۔ میری آنکھوں سے دو چھوٹے چھوٹے آنسو نکل آئے۔ میں نے جلدی سے انہیں پونچھ لیا۔ ایک زبردستی کی مُسکراہٹ چہرے پر پیدا کی۔۔۔ اور کھڑکی بند کر دی۔

# لیڈی ڈاکٹر

ہم سب لوگ کشمیر میں تھے کہ بھیّا ذکری کی شادی کی اطلاع ملی۔ اطلاع بھی اتنی کہ مِس مُشتری سے شادی ہو گئی ہے۔ کُنبے بھر میں طوفان بپا ہو گیا۔ جو بھی سُنتا وہ بھیّا ذکری کو حسبِ توفیق بُرا بھلا کہتا۔ ویسے ذکری کی حرکات سے پتہ چلتا تھا کہ چھٹیوں میں کچھ نہ کچھ بیہودگی کر بیٹھیں گے۔ چنانچہ کُنبے کے جانے کے بعد میدان صاف پا کر اُنہوں نے جھٹ پٹ شادی کر ڈالی اور یہ مُشتری صاحبہ کون تھیں۔ ڈاکٹر مِس مُشتری۔ ایم بی بی ایس۔ ذکری اور مُشتری ایک کالج کے دنوں کا رومانس تھا۔ ذکری تو ایک عرصے سے شادی پر تُلے بیٹھے تھے۔ مگر مُشتری کہتی تھی کہ پہلے ڈاکٹر ہو جاؤں پھر شادی وادی کی جائے گی۔ چنانچہ مئی میں نتیجہ نکلا اور جون میں شادی ہو گئی۔ کوئی ہفتہ تک تو کُنبے بھر میں گفتگو کا یہی موضوع رہا۔ ”شادی اچانک کیوں کی؟“ کِس مسخرے نے کہا تھا؟“ لڑکی بھی لڑکیوں جیسی نہیں کم بخت لونڈا ہے۔ ذکری نہایت بدتمیز ہو گئے ہیں۔ خدا جانے کل کیا کر بیٹھیں گے۔“ ”آخر ہمیں کیوں اطلاع دی گئی؟“ اُدھر چچی امّاں

تھیں کہ صاحبزادے کی اس حرکت پر بے حد خفا تھیں۔ آخر دو تین ہفتوں کے بعد ذکری صاحب کے حال پر فاتحہ پڑھ لی گئی اور صبر کر لیا تھا۔

جہاں سب لوگ خفا تھے وہاں مجھے اُلٹا ذکری کی زندگی پر رشک آ رہا تھا۔ بھلا جسے ڈاکٹر بیوی مل جائے اسے اور کیا چاہیئے؟ سمجھ لیجئے کہ ساری عمر کیلئے تندرستی کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ خوب چاق و چوبند رہو، بچّے بھی گلیکسو بے بی جیسے۔ یہاں تک کہ پڑوس والے بھی ہٹے کٹے رہیں۔ ویسے ذرا سا سینے میں درد ہو جائے تو آدمی فوراً وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ کہیں نمونیا تو نہیں ہو رہا؟ ساری رات نیند نہیں آتی۔ صُبح صُبح کسی ڈاکٹر کے پاس دوڑے دوڑے جاؤ۔ فیس دو۔ اگر وُہ ہنس کر کہہ دے کہ سینہ بالکل صاف ہے۔ غالباً آپ وہمی معلوم ہوتے ہیں۔" تو مارے شرم کے زمین میں گڑتے آؤ۔ اور اگر بیوی ڈاکٹر ہو تو واللہ، اسی وقت سٹیتھوسکوپ (ربڑ کی نلکی) لگا کر سینہ دیکھ لے اور اُنگلیوں سے ٹھوک بجا کر ایک دو تین کہلوا کر پانچ منٹ میں ملاحظہ کر لے۔ چلئے اللہ اللہ خیر صلّا، اس کے بعد آرام کیجئے۔ دُنیا بھر کے بہترین ٹانک پیجئے۔ خوراک کے بہترین اجزاء حاصل کیجئے۔ مقررہ وقت پر خوراک، مناسب وقت پر نیند، حساب لگا کر ورزش۔ بس دو تین مہینوں میں پورے پہلوان بن جایئے۔ میں بڑی دیر تک ذکری کی خوش نصیبی پر رشک کرتا رہا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود سب سے بڑی بات یہ تھی کہ

ان میں رومانس بھی تھا۔۔ آہاہاہا!!!! میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ واقعی خدا جب دیتا ہے تو چھپڑ چھاڑ کر دیتا ہے۔ دوسرے مہینے کالج کھلا۔ ذکری صاحب ملے۔ انہوں نے مشتری سے تعارف کرایا۔ "یہ ہیں تمہاری بھابھی!" اور "یہ (میری طرف اشارہ کرکے) میرے رشتے کے بھائی ہیں۔"

میں نے مؤدبانہ سلام کیا اور دیکھا کہ اچھی خاصی شکل کی لمبوترے سے مُنہ کی، تیز طرّار سی خاتون مجھے عجیب طرح دیکھ رہی ہیں۔

"اچھے ہو نا بھئی؟" وُہ بولیں۔

"جی ہاں۔ باللہ!"

"کبھی بیمار تو نہیں ہو جاتے؟"

"جی ابھی تک تو ایسا اتفاق نہیں ہوا اور نہ فی الحال کوئی ارادہ ہے!"

"بڑے شریر معلوم ہوتے ہو۔ بالکل زہرہ کی طرح، ہے نا؟" ذکری صاحب نے سر ہلا دیا۔

"بالکل ویسا ہی چلبلا سا ہے۔"

اب میرے لیے یہ معمّہ بن گیا۔ یہ مُشتری تو خیر سے تھیں۔ اب یہ زہرہ کون ذاتِ شریف ہیں۔

میں نے ذرا مُنہ بنا کر کہا۔ ”کیا فرمایا آپ نے، کیسا شریر ہوں؟“

”زہرہ جیسے! تم نہیں جانتے اُسے شاید، ہاں تم نے کہاں دیکھا ہو گا؟ اگلے مہینے آئے گی۔ اچھّی طرح جان لو گے۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ زہرہ بی خیر سے مُشتری کی بہن تھیں اور ہو بہو اپنی بہن کے نقشِ قدم پر چل رہی تھیں، یعنی ڈاکٹری پڑھ رہی تھیں۔

میں نے دل میں سوچا کہ خیال تو بُرا نہیں اگر زہرہ بھی اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگیں اور ایک ہی کُنبے میں دو لیڈی ڈاکٹر اکٹھی ہو جائیں۔ جتنا رشک مجھے ذکری پر آ رہا تھا اب اس سے نصف رہ گیا۔

دوسرے روز کا ذکر ہے کہ کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بڑا اچھّا لطیفہ ہوا۔ سب ہنسنے لگے۔ ذکری بھی مُنہ کھول کر خوب زور سے ہنسے۔ یکایک مشتری بولیں:

”ذرا پھر سے مُنہ پھاڑیئے گا۔“ ذکری جھینپ گئے۔

وُہ پھر بولیں۔ ”ذرا کھولیے تو سہی!“

سب لوگ متوجہ ہو گئے کہ یہ کیا ہونے لگا ہے۔

”کہہ رہی ہوں کا ذرا مُنہ تو کھولئے گا۔“ ذکری نے مُنہ کھول دیا۔

”اور ہاہا کیجئے۔“ ذکری نے ہاہا کر دیا۔

”میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ آپ کے ٹانسل بڑھے ہوئے ہیں اور شاید سیپٹک بھی ہیں اور حلق کی پچھلی دیوار پر چھوٹے چھوٹے دانے اُبھرے ہوئے ہیں۔ جبھی آپ کی صحت اتنی اچھی نہیں رہی جتنی دو تین سال پہلے تھی۔ گلے کی خرابی سے دل اور معدے پر بہت اثر پڑتا ہے۔ میرے خیال میں آپ انہی سردیوں میں آپریشن کرا لیجئے اور اس وقت تک مینڈل پینٹ لگاتے رہئے اور نمکین پانی کے غرارے کرتے رہئے!“

ذکری چپ چاپ سہم کر بیٹھے تھے۔ دو تین ”بڑی بیویوں“ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ تین چار لڑکیاں مُسکرانے لگیں۔ کچھ بچّے ذکری کی ہاہا پر ہنس پڑے۔ ایک نے تو ذکری سے پھر اسی طرح کرنے کو کہا۔ کیونکہ اسے لُطف آیا تھا۔

شام کو میں مُشتری صاحبہ کے کمرے میں کوئی ناول وغیرہ تلاش کرنے گیا۔ دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف دس دس پندرہ پندرہ سیر کی کتابیں پڑی تھیں۔ سرجری، میڈیسن، مڈوائفری، ہائیجین۔۔۔ مُردوں کی تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ میزوں پر ڈاکٹری کے مختلف آلے رکھے تھے۔ رسالے دیکھے تو اُن میں تصویریں ایسی تھیں کہ کپکپی سی آنے لگتی تھی اور ہاں۔۔۔ بستر پر ایک مُردے کی کھوپڑی اور لمبی ہڈی (جو غالباً ٹانگ کی تھی) اور دو تین چھوٹی ہڈیاں بھی پڑی ہُوئی تھیں۔ میں جلدی سے بھاگا۔ لاحول ولا قوۃ، کمرہ نہ ہوا، قبرستان ہو گیا۔

میں چار بجے کرکٹ کھیلنے جا رہا تھا۔ دیکھتا ہوں کہ ذکری ٹینس کا بلّا لیے ہوئے کلب سے واپس آ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ”بات کیا ہے؟“ بولے۔ ”جی اچھّا نہیں۔“

مشتری صاحبہ آئیں۔ نبض دیکھی گئی۔ تھرمامیٹر لگایا گیا۔

بولیں۔ ”نہایت ہلکا ہلکا بخار ہے۔ عموماً چار بجے آپ کی طبیعت گری گری تو نہیں رہتی؟“

ذکری صاحب بولے۔ ”ہاں کچھ ایسی ہو ہی جاتی ہے۔“

"اور ذرا زیادہ کھیلنے سے تکان تو نہیں ہو جاتی؟"

"ہاں ہو تو جاتی ہے!"

"اور کبھی کبھی رات کو پسینہ تو نہیں آتا؟"

"کبھی کبھی آجاتا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ ویسے آپ کا وزن بھی پہلے سے کم ہو گیا ہے۔ مجھے تو پہلے ہی شُبہ ہو چلا تھا۔"

چچی جان بولیں۔ "کیا شُبہ ہو چلا تھا؟ کیا ہُوا آخر؟ ذرا سا بخار ہے۔ اُتر جائے گا۔"

"اجی ذرا سا بخار تھوڑا ہی ہے۔ خدا رحم کرے۔ یہ علامات تو ساری تپِ دِق کی ہیں۔ اس موذی مرض کی شروع شروع کی یہی نشانیاں ہوا کرتی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ کل ایکسرے کرا لی جائے۔"

"اوئی! نوج ۔۔ کہنے والے کے مُنہ میں خاک۔" چچی جان تیزی سے بولیں۔ "پہلے کچھ سوچ تو لیا ہوتا۔ جو مُنہ میں آیا، کہہ دیا۔ اس کے دشمنوں کو ہو تپِ دق۔"

اس روز چچی امّاں جو خفا ہوتی ہیں۔۔بس خدا کی پناہ! ایک دو مہینے تک ذکری کو یہی وہم رہا کہ تپِ دق اب ہُوا۔ اب ہُوا۔ کھیلنا کودنا سب بند۔ ہر وقت گھڑی سامنے ہے اور یہ نبض گن رہے ہیں۔ آدھ آدھ گھنٹے کے بعد تھرمامیٹر لگایا جارہا ہے۔ آخر بڑی مشکل سے ان کا یہ وہم دور ہوا۔ یکلخت گھر کی فضا ہی بدل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچّہ بچّہ مریض ہے اور سب کے سب ہیں کہ سیدھے مُشتری کے پاس آرہے ہیں۔ "آپا دیکھنا میرا حلق۔" "آپا دیکھنا میرا پیٹ۔" "آپا مجھے زکام ہے۔" "میرا صُبح سے جی اچھّا نہیں ہے!" "میرے سینے میں رہ رہ کر درد اُٹھتا ہے۔" اُدھر آپا ہیں کہ نہایت اطمینان سے ملاحظہ کرتی ہیں اور ایک ایک کو نسخہ لکھ دیتی ہیں۔ الماریوں پر، میزوں پر، انگیٹھیوں پر، جہاں دیکھو دوائیوں کی شیشیاں پڑی ہیں۔ عجیب عجیب رنگ کی، بدبودار دوائیاں، گھر ہسپتال بنا ہوا تھا اور اُدھر محلّے کا محلہ بیمار پڑ گیا۔ صُبح سے شام تک عورتیں اور بچّے مُشتری سے ملنے آرہے ہیں۔

زہرہ کے خطوط باقاعدگی سے آیا کرتے۔ مشتری نے خطوں میں میرا تعارف کرا دیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں کی خط و کتابت بھی ہوا کرتی۔ اس کی تحریر میں شوخی کُوٹ کُوٹ کر کیا بلکہ ٹھونس ٹھونس کر بھری ہُوئی ہوتی اور خط سے عموماً ٹنکچر آیوڈین کی بُو آیا کرتی۔ کبھی کبھی آئیڈوفارم اور کلوروفام کی مہک بھی ہوتی تھی۔

نہ معلوم اس کے خطوط مجھ پر کیا اثر کر رہے تھے کہ میں نے جج صاحب کے ہاں جانا کم کر دیا تھا۔ حالانکہ دوسرے تیسرے دن ڈانٹ پڑتی کہ وہاں کیوں نہیں جاتے۔ وُہ لوگ بار بار شکایت کرتے ہیں۔ ویسے جج صاحب کی کوٹھی کالج کے بالکل نزدیک ہی تھی۔ کیا تو میں ہر دوسرے تیسرے روز وہاں جایا کرتا اور کیا اب کہ کبھی کبھار دوسرے تیسرے ہفتے جاتا تھا۔ جج صاحب ایک عرصے سے مجھے پسند کرتے تھے اور شاید ان کی لڑکی رضیہ کو بھی میں بہت دنوں سے اچھا معلوم ہو رہا تھا اور مجھے بھی وُہ اچھی لگتی تھی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ زہرہ میرے اور رضیہ کے درمیان آتی جا رہی ہے۔ ادھر مُشتری جب باتیں کرتیں تو مجھے اور زہرہ کو ہمیشہ گھسیٹ لیتیں۔ دونوں کے مزاج ایک سے ہیں۔ دونوں کی حرکات ایک سی ہیں۔ زہرہ بھی سینما کی بڑی شائق ہے۔ اسے بھی کتّے بُرے لگتے ہیں۔ وُہ بھی امرود بڑے شوق سے کھاتی ہے۔ غرضیکہ جو کچھ برائیاں اور خوبیاں مجھ میں تھیں۔ غالباً وُہ سب کی سب زہرہ میں پائی جاتی تھیں۔

رضیہ مجھ میں یہ تبدیلی پا کر بڑی حیران تھی۔ جب کبھی میں ان کے ہاں جاتا رضیہ کی امّاں کے پاس مُنہ پھُلائے بیٹھا رہتا اور دو چار منٹ اِدھر اُدھر کے چکّر لگا کر واپس چلا جاتا۔ پہلے یہ تھا کہ میری یہی کوشش ہوا کرتی کہ کسی طرح رضیہ سے ہی باتیں کرتا رہوں اور رضیہ کی امّاں کو بڑی حسرت تھی کہ کبھی میں ان

کے پاس نچلا ہو کر بیٹھ جاؤں۔ اگر رضیہ کہیں مل بھی جاتی تو عجیب بے تکی سی باتیں کرتا۔ مثلاً آج کل گرمی بہت ہے۔ کل رات مچھّر بہت تھے، بارش ہو جانی چاہئے۔ پرسوں ہمارا میچ ہو گا، ابّا جی کا کیا حال ہے؟ بس دو چار ایسی باتیں کیں اور وہاں سے بھاگا۔۔۔ وُہ اپنی لمبی لمبی پلکوں کو اٹھائے اپنی خوبصورت آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہ جاتی اور اپنے نازک سے دماغ میں سوچتی ہو گی کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔ کئی مرتبہ وُہ ہمارے ہاں آئی بھی، میں بہتیری کوشش کرتا کہ کسی طرح اس بے رُخی کو چھُپا سکوں۔ خواہ مخواہ ہنستا اور مُسکراتا۔ مگر وُہ سمجھ جاتی۔

ادھر چچی جان تھیں کہ مُشتری سے بیزار ہوتی جا رہی تھیں۔ سب کے سب بیٹھے ہیں۔ اچھی اچھی باتیں ہو رہی ہیں۔ یکایک مُشتری صاحبہ کو جو کچھ خیال آیا تو فوراً ڈاکٹری کی باتیں شروع کر دیں، اگر پیٹ میں داہنی طرف درد ہوا تو اپنیڈے سائیٹس ہوا کرتا ہے۔ کمر کی درد کی وجہ سے عموماً گردے کا پتھّر یا گردے کا پھوڑا ہوتی ہے۔ اگر ہر وقت سر میں درد رہے تو خون کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ جہاں اُنہوں نے اس قسم کی باتیں شروع کیں چچی جان وہاں سے فوراً اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اُن کا اس طرح اُٹھنا مُشتری کو محسوس بھی ہوتا، مگر وُہ بے چاری عادت سے مجبور تھیں۔ شاید اُنہیں سوائے اس قسم کی باتوں کے اور کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ کم از کم مجھ میں سو یا ڈیڑھ سو بیماریاں

ہوں گی۔ کیونکہ جس مرض کی علامتیں وُہ بتائیں۔۔۔ صُبح تک تقریباً تمام کی تمام ہی اپنے آپ میں پاتا۔ رات کو میرا ہاتھ کبھی دل پر ہوتا تو کبھی پیٹ پر، اور کبھی آئینے میں اپنا گلا دیکھ رہا ہوں۔ بعض اوقات نیند حرام ہو جاتی۔ جھنجھلا جھنجھلا پڑتا کہ یہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لے لی۔ پھر دوسرے روز اس بیماری کا علاج پوچھتا جو کہ عموماً آپریشن ہوا کرتا۔ حتیٰ کہ دو چار روز تک ایک دوسری بیماری شروع ہو جاتی جو ایک دو روز رہتی اور پھر ایک اور۔۔۔! اور ذکری۔۔۔۔

ذکری کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صُبح پانچ بجے اُٹھنا پڑتا تھا۔ ذرا دیر ہو جائے تو مُشتری آدھ گھنٹے تک لیکچر دیتی رہتی۔ چائے پر گنی گنائی چیزیں ملتیں تھیں۔ ادھر ہم تھے کہ خواب اناپ شناپ بھرتے۔ ذرا ذکری نے ڈرتے ڈرتے کسی چیز کی فرمائش کی اور اُدھر سے کورا جواب مل جاتا۔ صُبح صُبح مچھلی کا تیل۔ مارمائیٹ، لوہے کا ٹانک، دوپہر کوفی راڈول، بودی رول اور خُدا جانے کیا الا بلا۔ جس روز وُہ انڈے کھالیتے اس روز کبابوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ دوپہر کو گھنٹہ بھر سے زیادہ سو نہیں سکتے تھے۔ ٹینس کے فقط دو سیٹ کھیل سکتے تھے۔ مہینے میں دو پکچر، رات کے دس بجے سو جانا۔۔۔ غرضیکہ عجب بے ہودہ سی زندگی ذکری بسر کر رہے تھے۔ باوجود ان ساری ادویات و ہدایات کے وُہ مہینوں کے مریض معلوم ہوتے تھے۔ آخر ایک روز ٹنکچر سے مہکا ہوا خط آیا جس میں زہرہ نے اپنی آمد کی

اطلاع لکھی تھی۔ سب سے زیادہ انتظار اور اشتیاق اُس کے آنے کا مجھے تھا۔ مُشتری نے اُسے لینے کے لیے مجھے ہی بھیجا۔

اسے رات کے نو بجے آنا تھا۔ ذکری اس روز کار میں کہیں جا رہے تھے۔ وُہ بے چارے موٹر سائیکل پر پھٹ پھٹ کرتے گئے اور میں کار میں اسٹیشن پر لے کر پہنچا۔ زہرہ ٹرین سے اُتری بالکل اپنی بہن کی نقل وہی شکل و صورت بالکل وہی خاکہ۔ مگر حد سے زیادہ اُونچی ایڑیوں کے جوتے، حد سے زیادہ لمبے بُندے کانوں میں، بہت ہی شوخ رنگ کی ساڑی، ہونٹوں پر ضرورت سے زیادہ لپ اسٹک، بے تحاشا میک اَپ اور نا قابلِ برداشت سینٹ کی خوشبو۔

جب ہم واپس آ رہے تھے اور وُہ سوالوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ جہاں سینٹ کی تیز خوشبو کی لپٹیں بُری طرح سے دماغ میں گھُس رہی تھیں۔ وہاں کبھی کبھی ایک بھبھکا ٹنکچر آئیوڈین کا بھی آ جاتا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ میرے مضامین فارسی اور فلسفہ ہیں تو اُسے کچھ افسوس سا ہوا۔

زہرہ کے آنے سے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی۔ جتنی شوخ اور چنچل مُشتری بتاتی تھیں، یہ ماشاء اللہ اس سے دو تین بالشت آگے ہی نکلیں۔ مگر ساتھ ہی ایک

عجیب تماشا شروع ہو گیا۔ جہاں دونوں بہنیں بیٹھتیں، وہیں مریضوں کی باتیں شروع کر دیتیں۔

ایک روز ہم سب کسی دعوت میں مدعو تھے۔ اتّفاق سے کہیں ایک پیٹو سا بچّہ نظر آیا۔ مشتری بولیں۔ ''بتاؤ کیا ہے اس بچّے کو؟''

''جگر بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''

''ہشت! ذرا پھر سے دیکھو۔''

''تو پھر پیٹ میں پانی پڑا ہوا ہو گا۔''

''ذرا ہڈیوں کی بناوٹ بھی دیکھو نا!'' مشتری بولیں۔

''ہاں! رکٹس ہے، ہے نا آپا؟''

''تم بھی بس یُونہی ہو، اب تک محض وقت ضائع کیا ہے تم نے۔ اتنی سی تشخیص نہیں ہُوئی۔ ایک دفعہ ہسپتال میں ایک عجیب مریض آیا۔ ہاتھ پاؤں سوجے ہوئے، نبض تیز، کہیں کھانس رہا ہے، کہیں اُبکائیاں لے رہا ہے۔ کہتا تھا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپتے ہیں۔ عجیب سی ہسٹری دینے لگا۔ سب نے تشخیص

کی۔ سب کے سب غلط نکلے۔ لیکن میں نے ٹھیک بتایا۔ سینے کے اندر ایک رسولی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے دل کو دبالیا تھا!"

دونوں بہنوں کی فضول سی باتوں پر سب پہلے ہی سے مُنہ پھُلائے بیٹھے تھے۔ بچّے کی طرف اشارہ کرنے پر بچّے کی والدہ تلملا اُٹھیں "اچھا! بس بیمار ہو گا تو ہمارے لیے ہو گا۔ جس روز آپ کے پاس علاج کرانے کے لیے لائیں تب بے شک نہ کیجیے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ کہیں اس کی ٹانگیں نہ مُڑ جائیں اور یہ عمر بھر کے لیے بے کار نہ ہو جائے۔ کیونکہ رکٹس تو ہے ہی ہڈیوں کی دشمن!" زہرہ نے دوسری حماقت کی۔ قریب تھا کہ بچّے کی والدہ ایک تیز سا جواب دیں کہ دو تین اور خواتین آ گئیں اور معاملہ دب گیا۔ جب ہم واپس آ رہے تھی تو اپنی چچی اماں مُشتری اور زہرہ کی انتہائی نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔

صُبح صُبح کا ذکر ہے کہ ہم پلاٹ میں چائے پی رہے تھے۔ ذکری کو شاید کہیں جانا تھا۔ اُنھوں نے دو تین گھونٹ جو گرم چائے کے جلدی سے لیے تو اچھّو لگ گیا۔ اچھّو ٹھیک ہو گیا۔ مگر ہر دو تین منٹ کے بعد تھوڑا سا کھانسنے کا شوق فرما لیتے تھے۔ مُشتری نے زہرہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "ذرا اب کی دفعہ

کھانسیں تو سننا۔" ذکری پھر کھانسے!" استھما (دمہ) ہے یا ٹوبر کلوسس (تپ دق)؟"

مُشتری بولی۔ "پگلی کہیں کی، استھما میں کہیں اس طرح کی کھانسی ہوتی ہے بھلا؟"

"تو آپا لگالو شرط! پچھلے مہینے میں نے ایک کیس استھما کا دیکھا تھا۔ بعینہ ایسی کھانسی تھی۔"

"اچھا تو دیکھ لیتے ہیں۔ نکالو اسٹیتھوسکوپ!"

ذکری سے کہا گیا کہ میز پر لیٹ جائے اور قمیض اتار دیجیے۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر مُشتری بولیں۔ "چلئے یونہی دیکھ لیتے ہیں۔ آپ بیٹھے رہیے۔"

چچی اماں نے پیالی زور سے پرچ پر ماری اور رومال سے مُنہ پونچھتی ہُوئی اُٹھ کھڑی ہو گئیں۔

ذکری کا معائنہ شروع ہوا۔ کبھی سانس رُکوایا گیا۔ کبھی زور زور سے سانس لینے کو کہا۔ کبھی کہا "کھانسو" یکایک زہرہ چلا اُٹھی "وُہ سُنئے فرکشن نوٹ۔" (رگڑ کی آواز)۔۔۔ ذکری کا رنگ زرد ہو گیا۔

مشتری نے نلکی لگائی۔ ”ارے غضب خُدا کا فرکشن ہی تو ہے اور ہے بھی کسی قدر بلند۔“

زہرہ نے میری طرف دیکھا۔ ”ادھر آیئے آپ بھی سُن لیجئے!“ میں نے زبردستی کانوں میں نلکی لگائی، ایک عجیب سی آواز آئی۔ ”چرر۔۔۔ شوں۔۔۔ چٹاخ شٹریں“ ذکری نے دوبارہ سانس لی اور پھر یہی آواز آئی۔

”بھی، اب تو چھاتی کو ٹھوک بجا کر دیکھنا پڑے گا۔ اگر خدانخواستہ کچھ ایسا ویسا معاملہ ہُوا تو آج ہی ایکسرے کرا لیتے ہیں۔“ مشتری بولیں۔ ذکری صاحب کو میز پر لٹایا گیا اور قمیض اتار دی گئی۔

”ارے یہ کیا؟“ میری زبان سے نکل گیا۔ اُن کے باریک بنیان کی جیب میں ایک دس روپے کا نوٹ رکھا تھا۔ ”لاحول ولا قوۃ! کہیں اسی نوٹ کی آواز تو نہیں تھی جسے آپ فرکشن نوٹ کہہ رہی تھیں۔“ مشتری تو کچھ کچھ قائل ہو گئیں مگر زہرہ چہک کر بولیں۔ ”لو اور سُنو۔ کہہ دیا، لاحول ولا۔۔۔ ویسے ہی، وُہ تو صاف فرکشن تھی۔“ اب جو ذکری کے سینے کو نلکی لگا کر دیکھتے ہیں تو کچھ بھی نہ نکلا۔۔۔ وُہ نوٹ ہی کی آواز تھی۔

ذکری قمیض چھوڑ کر وہاں سے بھاگے اور دونوں بہنیں ایک دوسری کی طرف دیکھ کر مُسکراتی رہ گئیں۔

شام کو میں اور زہرہ پکچر دیکھ کر آئے۔ دیکھا کہ ذکری کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ میں آہستہ سے گیا اور چپکے سے کان لگا کر سننے لگا۔ ذکری اپنے دوست سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ''بھئی ایمان سے کوئی ایک بات ہو تو کہوں بھی۔ شادی کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک روز میں اس سے اظہارِ محبّت کر رہا تھا۔ یونہی آدھ گھنٹے تک بکے گیا (قہقہہ) یہ چپ چاپ بیٹھی مُسکراتی رہی۔ پھر بولی۔ 'آپ کے کان بڑے سُرخ ہو رہے ہیں۔ دیکھوں آپ کی نبض۔' نبض دیکھی، پھر ہاتھ دل پر پہنچا اور بولی 'ارے! آپ کا دل بہت بری طرح سے دھڑک رہا ہے۔ یہ ابھی اس طرح ہو رہا ہے یا ہمیشہ یونہی دھڑکا کرتا ہے۔ دیکھوں تو سہی۔۔۔' اُس نے گلے سے اسٹیتھوسکوپ نکالی اور لگی معائنہ کرنے۔۔۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد بولی 'حرکت کی آوازیں تو ٹھیک ہیں، البتہ اعصابی کمزوری کی وجہ سے کہیں کہیں بے قاعدگی ہو جاتی ہے۔ دھڑکن کی تیز ہونے کی وجہ کسی حد تک خون کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔'

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ وُہ بولی۔ ’ہاں ہاں کہیے ! آپ کیا کہہ رہے تھے۔ جہاں ختم کیا تھا۔ وہیں سے شروع کر دیجئے!‘ پھر ایک دن کا ذکر ہے کہ اس نے کچھ پوچھا۔ میں نے شوخی سے کہا کہ کان میں بتاؤں گا۔۔ ابھی میں مُنہ اچھی طرح قریب نہیں لے گیا تھا کہ وُہ بولی ’آپ دانتوں کے لئے کون سی پیسٹ استعمال کرتے ہیں؟‘ میں حیران رہ گیا۔ کہنے لگی۔ ’معاف کرنا! اس وقت آپ کے مُنہ سے ناخوشگوار سی بو آ رہی ہے۔ غالباً پائیریا ہو گا۔ ویسے بھی آپ کے مسوڑھے کچھ کالے کالے سے ہیں۔ آپ یو تھائیمول پیسٹ استعمال کیا کریں اور دن میں تین چار مرتبہ لسٹرین کے غرارے کیا کریں اور ایسی چیزوں سے پرہیز کیا کریں جن میں نشاستہ زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً کیلے، آلو وغیرہ۔ ورنہ دانتوں پر بُرا اثر پڑے گا۔‘

مجھے بہت برا لگا اور میں اُٹھنے ہی لگا تھا کہ یہ بولی۔ ’آپ کہئے نا چُپ کیوں ہو گئے۔‘ پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ’ابھی میرے پاس دس منٹ ہیں۔ اس وقفے میں آپ کہہ سکتے ہیں۔‘ توبہ توبہ! یہ تو بالکل نا قابلِ برداشت ہے۔ کہاں اظہارِ محبّت اور کہاں مُنہ کی بدبُو اور دل کی بیماریاں۔۔۔ ایمان سے یار میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔ اب تُو ہی بتا کہ کیا کروں؟“

”میاں اب گلے میں ڈھول ڈالا ہے تو بجانا ہی پڑے گا۔“

"مصیبت تو یہ ہے کہ جناب بیگم صاحبہ مجبور کر رہی ہیں کہ زہرہ کی شادی بھی یہیں ہو!"

"اور ادھر جو جج صاحب کے ہاں رشتہ ہے!"

"ہے تو سہی مگر یہ لڑکا کچھ شوخ مزاج ہے۔ رضیہ ہے بالکل بھولی بھالی اور زہرہ چنچل اور طرّار ہے۔ کہیں یہ احمق بھی میری طرح غلطی نہ کر بیٹھے۔ ویسے آج کل ان دونوں میں بڑی گاڑھی چھنتی ہے۔ صُبح سے شام تک ساتھ پھرتے ہیں۔ ابھی تک سینما سے واپس نہیں آئے۔ یہ لڑکا عجیب سر پھِرا ہے۔ یا تو ہر وقت رضیہ کا کلمہ پڑھا کرتا تھا اور یا اب اس جاپانی گڑیا پر لٹّو ہوا پھرتا ہے۔"

"اجی کہاں رضیہ اور کہاں یہ کلموہی۔ وُہ اتنی پیاری لڑکی ہے اور ان حضرت کا خیال بھی بہت کرتی ہے۔ اپنے کالج میں اس نے منگنی کا ذکر کر دیا ہے۔ اگر خدانخواستہ کچھ ایسی ویسی بات ہو گئی تو دل ٹوٹ جائے گا اس کا!۔"

"یار میں بھی تو بے بس ہوں۔ یہ لڑکا ہے ضدّی سا۔ ویسے میں بول بھی نہیں سکتا۔ گھر میں اس کی خوب چلتی ہے۔ جو بھی اپنے ابّا کو لکھ دے گا وُہ وہی مان لیں گے۔"

"کیوں سچ بتانا، زہرہ میں سے ایک خاص قسم کی بُو تو نہیں آتی؟"

"کیسی بھلا؟"

"ٹنکچر آیوڈین کی!۔۔۔ کہیں ہے اسے بطورِ سینٹ تو نہیں استعمال کرتی؟۔۔۔"

(قہقہہ)

اتنے میں مجھے چھینک آنے لگی، بہتیرا روکا مگر ضبط نہ ہو سکا۔ آخر اس کمبخت چھینک نے سارا مزا کرکرا کر دیا اور مجھے بھی اندر جانا پڑا۔

دوسرے روز کالج میں میرا ٹینس کا میچ تھا۔ میں فائنل تک پہنچ گیا تھا۔ زہرہ بھی ساتھ دیکھنے گئی۔ وہاں میں ایک نکمّے سے کھلاڑی سے بہت بُری طرح ہارا۔ میچ ختم ہوتے ہی میں نے بھاگنا چاہا۔ زہرہ سارے راستے مجھے چھیڑتی گئی۔ "آپ کو کیا ہو گیا تھا آخر؟ ایسے اناڑی سے ہار گئے؟ اُسے تو میں ہرا دیتی۔ نہ جانے آپ فائنل تک پہنچ کیسے گئے؟ شاید آپ ایسے ہی کھیلتے ہوں گے۔" کچھ تو ہارنے کا افسوس اور کچھ یہ چبھتے ہوئے فقرے۔۔۔ میں رونے ہی لگا تھا۔ گھر پہنچ کر زہرہ نے میرے ہارنے کی داستان خوب مرچ لگا کر سُنائی۔ چھوٹے سے بڑے تک خوب ہنسے۔۔۔۔ "میاں غرور کا سر نیچا ہُوا کرتا ہے۔ ہمیں پہلے ہی پتہ تھا کہ تم فائنل نہیں جیت سکتے۔" میرا دل چاہتا تھا کہ خوب جی کھول کر روؤں۔

اتنے میں کار آکر رکی اور آپا اُتریں۔

"بڑی دیر لگا دی تم نے اتنی دیر تک مت کھیلا کرو۔" چچی جان بولیں۔ "راستے میں جج صاحب کے ہاں چلی گئی تھی۔ بھلا امتحان تو سر پر ہے۔ ان لوگوں کو پارٹی کی سوجھی ہے۔ آج کہہ کر آئی ہوں کہ فی الحال پروگرام ملتوی کر دیا جائے"

"رضیہ تو مجبور نہیں کر رہی تھی؟"

"وُہ بے چاری تو کمرے میں لیٹی ہُوئی تھی۔ کہتی تھی کہ سر میں درد ہے۔ اور بھیّا تم وہاں کیوں نہیں جاتے؟ وُہ سب کے سب تمہاری شکایت کر رہے تھے۔"

"جا رہا ہوں!" میں نے بے اختیار اٹھتے ہوئے کہا۔

"اب رہنے بھی دو، رات کو کہاں جاؤ گے؟" مشتری بولیں۔ "اگر سر میں درد ہے تو اسپرین بھیج دیتے ہیں۔"

میں سائیکل لے کر بھاگا۔ بے چاری کے سر میں درد ہے۔ میں کتنا بُرا ہوں۔ رُوٹھی ہو گی شاید۔ معافی مانگ لوں گا۔ کوٹھی پہنچ کر معلوم ہوا کہ سب کے سب سیر پر گئے ہوئے ہیں۔ رضیہ اپنے کمرے میں تھی۔ پھُول سا چہرہ کچھ کملایا ہوا تھا۔ ماتھے پر ایک رنگین رومال کی پٹی بندھی تھی۔ میرا ہی رومال تھا شاید! حنا کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مُسکرائی۔ "میں نے سُنا آج آپ ہار گئے۔"

"جی ہاں! آج میں بہت ہی برا کھیلا۔ دراصل میں کبھی فائنل جیت ہی نہیں سکتا۔ پچھلے سال بھی یہی ہوا تھا۔"

"چلئے کیا ہوا جو ہار گئے۔ اگلے سال سہی۔ شاید آپ تھک گئے ہوں گے۔ آج کل ویسے بھی امتحان کے دِن ہیں۔ کھیلنے کودنے کو دل چاہتا ہی نہیں۔ ورنہ آپ کھیلتے تو بہت ہی اچھا ہیں۔"

یہ پہلی تسلی تھی جو کسی نے مجھے دی۔

"آپا نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے سر میں درد ہے۔"

"کچھ ایسا درد بھی نہیں، بس ان لوگوں کے ساتھ سیر پر جانے کو میرا دل نہیں چاہا۔ کل میں سینما بھی نہیں گئی۔ بھیّا کہہ رہے تھے کہ آپ بھی سینما آئے ہوئے تھے۔" میرا دل بیٹھ گیا۔ تو اسے پتہ تھا کہ زہرہ اور میں دونوں سینما میں تھے۔

"ہاں گیا تھا۔ آپا مشتری کی چھوٹی بہن یہاں آئی ہُوئی ہیں۔ اُن کے ساتھ جانا پڑا۔"

"اچھا وہی تو نہیں جو پرسوں رات باغ میں آپ کے ساتھ جارہی تھیں؟"

"جی ہاں۔ وہی!" میں شرم سے گڑا جارہا تھا۔

"بھیّا اُن کی بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ میں بھی کیسی ہوں۔ ابھی تک اُن سے ملی تک نہیں۔ سُنا ہے جو اُن سے ملتا ہے، اُن کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔"

میرا سر اور بھی نیچا ہو گیا۔

کچھ دیر میں بُت بنا کھڑا رہا۔ "یہ کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟ دیکھوں تو سہی۔"

"کچھ بھی نہیں!" اس نے کتاب کے صفحات اُلٹے۔ ایک تصویر کتاب سے نیچے گر پڑی۔ میں نے لپک کر اٹھالی۔ یہ میری تصویر تھی اور اُس کی کے کونے پر رضیہ نے اپنی تصویر کاٹ کر چپکائی ہُوئی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظریں زمین پر گڑی ہُوئی تھیں۔ میں نے تصویر واپس کتاب میں رکھنا چاہی۔ وُہ آہستہ سے بولی۔ "کیا کیجئے گا واپس رکھ کر، اسے آپ ہی لے لیجئے!" میں سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ وُہ بولی "مگر یہ کونے کی تصویر علیٰحدہ کر لیجئے!" اب میں سمجھا، افّوہ! اس کا مطلب بڑا گہرا تھا۔ اُس نے گردن جھُکا لی۔ ایک موتی جیسا پیارا چمکدار آنسو اُس کی گھنی پلکوں سے نکل کر زمین میں جذب ہو گیا۔ میں بھی کتنا احمق تھا۔ جی میں آیا کہ معافی مانگ لوں، اسے منالوں۔۔ مگر پھر کسی چیز نے زبان روک دی۔

موٹر کے ہارن کی آواز سُنائی دی۔ میں گویا خواب سے چونک اُٹھا۔۔ جلدی سے وُہ تصویر اسی کتاب میں رکھ دی۔ جب میں واپس آنے لگا اور میں نے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اس وقت میں کچھ کچھ نانا فرنویس جیسا دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے زہرہ برآمدے میں کھڑی ملی۔ ''آخر آپ آ ہی گئے۔ کسی نے آپ کو پکڑ لیا تھا کیا؟''

کیا تو حنا کی خوشبو اب تک دماغ میں بسی ہُوئی تھی اور اب ایک دم ٹنکچر کی بو آئی۔۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔

''آخر یہ رضیہ ہیں کون بھلا؟'' اس نے میرا بازو پکڑ کر پوچھا۔

''آپا کی سہیلی ہیں!''

''اور آپ کی کیا ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں!''

''کیا ہے بھئی، کیوں لڑ رہے ہو آپس میں؟'' مشتری نے ہمیں بُلا لیا۔

رات بھر میں یہی سوچتا رہا کہ رضیہ اور زہرہ میں کتنا فرق ہے۔ مجھے رضیہ کی پُرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ ایک دفعہ رات کو ریڈیو سُنتے وقت میں نے دیکھا کہ

دیوار پر اس کی ناک کا سایہ عجب بے ڈھنگا سا پڑ رہا ہے۔ میں نے چپ چاپ جا کر اتنی ہی بڑی ناک دیوار پر کھینچ دی۔ اُس نے دیکھ لیا۔ دوسرے روز پوچھنے لگی۔ ''تو کیا واقعی آپ کو میری ناک بُری لگتی ہے؟'' اس بھولے پن سے کہا کہ میرے جی میں آیا کہہ دوں کہ مجھے تمہاری ناک اتنی پیاری لگتی ہے کہ بس! اگر خدانخواستہ میں کہیں زہرہ کی ناک بنا بیٹھتا تو اگلے روز وُہ میرے کان بنا ڈالتی! کہاں سادگی اور معصومیت اور کہاں یہ چلبلا پن اور شوخی۔ ویسے شوخ لڑکیاں بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ مگر یہ تو نہیں کہ ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہیں۔ ہوا دن میں ایک آدھ مرتبہ شوخی بھی کر لی۔

صُبح سے سارا کُنبہ پڑوس میں کسی شادی کی تقریب پر گیا ہوا تھا۔ میں کمرے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ سامنے فارسی کی کتاب اور خلاصہ کھُلے پڑے تھے۔ ایک طرف انگریزی اور فلاسفی کی کتابیں پڑی تھیں۔ کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا ہو چلا تھا۔ زہرہ اچھلتی کُودتی کمرے میں داخل ہُوئی۔ ''تم پڑھ رہے ہو؟ شاباش ہے! جب دیکھو پڑھائی، پڑھائی! آنکھوں کا ستیاناس کر کے چھوڑو گئے۔ پہلے ہی سینما دیکھ دیکھ کر خراب کر رکھی ہیں۔''

"ایں" میں چونک پڑا۔ میں حافظ کا کلام پڑھ رہا تھا۔ یکا یک خرمنِ عشق پر بجلی گری۔ میرا تخیّل اُلٹ پلٹ ہو گیا۔

"دیکھوں بھلا تمہاری آنکھیں۔" اُس نے میری پلکیں زبردستی اُلٹتے ہوئے کہا۔

"اررر! کچھ کچھ سرخی مائل ہیں۔ ابھی جا کر بورک لوشن سے دھو ڈالئے اور رات کو سوتے وقت پوٹارگل کے دو قطرے ڈال لیجئے!"

لاحول ولا قوۃ! مجھے وُہ بڑی بدتمیز لگی۔

"جج صاحب کا سارا کُنبہ وہاں تھا۔ صرف وُہ سُلطانہ رضیہ صاحبہ تشریف نہیں لائیں۔ آج پھر سر میں درد ہو گا شاید!"

میں نے ایک شعر گنگنایا "عیش باقی، لب ساقی، مے و جام است اینجا۔" "سراسر بے ہودگی ہے۔ زندگی کا فقط ایک رخ ہے۔ یہ مے و جام وغیرہ ہیں بیکار آدمیوں کی کام۔ اور کچھ کام نہیں ہوتا تو لوگ محبّت کرنے لگتے ہیں۔ محض ایک دماغی بیماری ہے محبّت۔ خواہ مخواہ اپنا وقت ایک فضول سی غلط فہمی میں کیوں ضائع کیا جائے! آپ نے ناحق فارسی لے کر اپنے خیالات تباہ کر لیے ہیں۔"

میں اُسکی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"بہتر ہوتا آپ ڈاکٹری پڑھتے، سائنس پڑھتے۔ انسان کی رگ رگ سے واقفیت پاکر ایسی چیزوں میں کوئی جاذبیت نہیں رہتی اور سب کچھ محض کھیل لگنے لگتا ہے۔۔۔ اور یہ شاعر۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔ ساری عمر چیختے رہیں گے، دل کباب ہو گیا، جگر چھلنی ہو گیا، یوں ہو گیا، ووں ہو گیا، ہے ناحماقت سراسر؟۔۔۔ اب آپ اُٹھیں گے یا نہیں؟ چلیئے باہر!"

اُس نے مجھے چونکا دیا۔۔۔ واقعی میں چونک پڑا۔۔۔ آج اس نے اپنا دل کھول دیا تھا!۔۔۔ نا بابا مجھے تصویر کا دوسرا رخ نہیں چاہئے! مجھے زندگی کی تلخیاں نہیں چاہئیں! مجھے عُمر خیام کی رُباعیاں ہی اچھی لگتی ہیں! میں اسی غلط فہمی میں تمام عمر غلطان رہنا چاہتا ہوں۔ ایسی روشنی سے تو میں تاریکی ہی میں بہتر ہوں۔۔۔ میرے لیے فارسی ہی نعمت ہے۔

وُہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔۔۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ ایسی فضا تھی جو عموماً حافظ کے شعروں پر طاری ہوا کرتی ہے۔ مجھے زہرہ بالکل اجنبی لگ رہی تھی۔ میں پلاٹ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ وُہ کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ ٹنکچر کی بدبُو نے میرے تخیل پر اثر کرنا شروع کر دیا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟" اُس نے میرے بال پریشان کرتے ہوئے کہا۔

”ذرا ادھر دیکھو میری طرف!“ وُہ میری ناک پکڑ کر بولی۔ ”میں پرسوں جا رہی ہوں۔“

”آپ جا رہی ہیں؟ گویا کہ پرسوں جا رہی ہیں آپ؟“

”تُم چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟“ اُس نے اپنی آواز سنجیدہ بنا کر کہا۔ ”میں۔۔۔ میرا مطلب ہے ہاں!۔۔۔۔ نہ نہ بھلا میں کیوں چاہنے لگا۔ مگر آخر تمہاری پڑھائی بھی تو ہے۔۔۔۔ وہاں بھی تو ہرج ہو رہا ہو گا۔“

”پڑھائی کو ڈالو بھاڑ میں۔۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔ کیا تمہیں میرا کچھ بھی خیال نہیں؟“

”آپ کا امتحان کب ہے؟“

”مجھے بنا رہے ہو؟ میں جو پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو۔“

لاحول ولا.......... کیا انوکھا طریقہ تھا اظہارِ محبّت کا۔ گویا مجھ پر رعب ڈال کر زبردستی محبّت منوائی جا رہی تھی۔۔۔۔ جیسے کوئی ہیڈ کانسٹیبل کسی سے محبّت کا اظہار کر رہا ہو، بھلا مجھے کیا؟ خواہ تم جاؤ یا نہ جاؤ (ٹنکچر کی بُو اور بھی تیز ہو گئی۔)

"اب تم بولو گے بھی یا نہیں؟" اس نے اپنا ہاتھ میری ناک پر پھیرتے ہوئے کہا۔ انتہائی درجے کی بدتمیزی تھی یہ!

دفعتاً اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تو گویا اب تک تم مجھ سے کھیلتے رہے ہو! بولو!"

یہ الفاظ بالکل اُس نے ایسے کہے جیسے کوئی ایکٹنگ کر رہا ہو اور یونہی تفریحاً کسی سے کہہ دے۔۔۔۔ اُس کی سخت اُنگلیاں۔۔۔ جو کہ زخموں کو چیرتی رہی ہوں گی۔ جنھوں نے نشتر پکڑے ہوں گے۔۔۔ میرا ہاتھ جیسے لوہے کے پنجرے میں آ گیا۔ دل سے آواز آئی۔ "مولانا بھاگو یہاں سے، ابھی وقت ہے۔ ورنہ تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو مشتری کے ہاتھوں ذکری کا ہُوا، ہو رہا ہے اور ہُوا کرے گا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ٹنکچر آیوڈین کی پوری شیشی میری ناک میں انڈیل دی ہو۔ جو ہڑبڑا کر وہاں سے بھاگتا ہوں تو پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

دروازے پر نوکر کھڑا تھا۔

"ذرا کار باہر نکال دینا۔" میں نے کہا۔

"کار تو باہر گئی ہے جناب!"

"تو پھر موٹر سائیکل ہی نکال دے!"

"اُسے چھوٹے میاں ابھی لے کر گئے ہیں۔"

"تو پھر میری سائیکل ہی لے آ۔۔۔!" میں نے جھلّا کر کہا۔

"اُس میں پنچر ہے سرکار!۔"

"ابے لے بھی آ، وہی نکال لا۔"

وُہ سائیکل نکال لایا، پچھلے پہیے میں ہوا بالکل نہیں تھی۔ میں نے سوار ہو کر بے تحاشا پیر مارنے شروع کئے۔ اور چل دیا سیدھا جج صاحب کی کوٹھی کی طرف۔۔۔ رضیہ اکیلی ہو گی۔۔۔ درد سر کا بہانہ کئے ہوئے بیٹھی پڑھ رہی ہو گی ۔۔۔کتاب میں میری تصویر رکھی ہو گی۔۔۔ پیارے پیارے ماتھے پر میرے رومال کی پٹی بندھی ہو گی۔۔۔ کمرے میں حنا کی بھینی بھینی خوشبو!

سڑک کے دونوں طرف درخت نور میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سائیکل کی کھڑ کھڑ مجھے اس وقت رولز رائیس کی گھر گھر سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ جو ہاتھ زہرہ نے پکڑا تھا اس سے اب تک ٹنکچر کی بُو آ رہی تھی۔

# وُسعت

جب میں نے پہلے اُن دونوں کو دیکھا تو مُسکراہٹ کی ایک لہر میرے لبوں پر دوڑ گئی۔ جیسے کسی پُر مذاق چیز پر عموماً ہوا کرتا ہے۔ کہاں ایک حُسن کا مجسمہ اور کہاں ایک بے ڈھنگا پتھرّ۔ بے ڈھب جس میں کوئی بھی تو جاذبیت نہ ہو۔ مجھ سے فلم نہ دیکھی گئی۔ بار بار اُن دونوں کو دیکھتا تھا۔ جتنا اُس لڑکی کی تمکنت نے مجھ پر اثر کیا۔ اتنا شاید اُس کے حُسن نے نہ کیا ہو گا۔ سینما میں اتنا ہجوم تھا اور تقریباً سب کے سب اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ لیکن کیا مجال جو اُسے اُس کا ذرا سا بھی احساس ہُوا ہو۔ لمبی لمبی پلکیں اُٹھائے بے پروائی سے دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

اور کوئی لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو شرما جاتی۔ سمٹ کر سیٹ میں گھُس جاتی یا سہم جاتی اور پسینہ آجاتا۔

اُس کے کپڑے بھی سادہ تھے۔ نہ اُس نے میک اپ ہی کیا ہوا تھا اور بیٹھی بھی تھی ایک بھونڈے سے لڑکے کے ساتھ، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اتنی اچھی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرا ٹائی درست کی اور کئی دفعہ اُس کو سامنے سے گزرا۔ اُس نے دیکھا ہی نہیں، ایک دفعہ دیکھا تو ایسی لاپروائی سے کہ پھر اُدھر سے گزرنے کو جی نہیں چاہا۔

پورے دو گھنٹے تک مجھے پتہ نہیں رہا کہ کیا فلم تھی اور کیا ہو رہا تھا۔ بس میں اُس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ جھلک اُس لڑکے کی بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ لمبی طوطے کی طرح کی ناک، بے تحاشا لمبا چوڑا ماتھا، رُخساروں کی ہڈیاں بڑی بے تکلّفی سے باہر نکلی ہوئیں، پچکے ہوئے گال پتلی، سوکھی ہُوئی گردن۔ بنی بنائی مِصر کی ممی!

سوٹ پہنے کا تو محض تکلیف ہی کیا گیا تھا۔ اگر نہ پہنتے تو کوئی فرق نہ پڑتا اور رنگ پر بھی دھواں سا لگا ہُوا تھا۔ میں نے کئی بار لاحول پڑھی۔

بھلا ان دونوں میں ذرا سی بھی مطابقت تھی کہیں۔

فلم ختم ہُوئی، جب تک وُہ ہال میں رہے۔ میں بھی ٹھہرا رہا۔ چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وُہ لڑکا کچھ کچھ لنگڑاتا بھی تھا۔ باہر وُہ دونوں کسی کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے جان بوجھ کر دیر لگادی کہ شاید ان دونوں کا کچھ اتہ پتہ ملے۔

میں نے سیاہ عینک لگائی اور لڑکی کو غور سے دیکھا۔ ہلکا ہلکا گلابی رنگ جیسے شفق کا عکس پڑ رہا ہو۔ سُرخ پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں جن میں ایک تناؤ تھا۔ یُوں لگتے تھے جیسے مُسکرا رہے ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں! جن میں کچھ حجاب سا بھی تھا اور کچھ بے باکی سی بھی۔ یا یوں کہ دونوں ملے جُلے سے! چھریرا اور لمبا قد! مگر ان سب کے باوجود جو چیز مجھے سب سے نمایاں لگی۔ وُہ اُس کی تمکنت تھی۔

لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میرا وہاں ٹھہرنا فضول لگ رہا تھا۔ میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔ چلو بھئی چلیں۔ پھر کبھی سہی۔ اپنی ہلکی سی موٹر سائیکل سنبھالی۔ ایک سگریٹ سلگا کر لبوں میں دبایا اور چل دیا۔ مجھے ابھی دس میل اُوپر جانا تھا۔ پہاڑی راستہ اُلٹے سیدھے موڑ اور پھر شام ہونے لگی تھی۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا دونوں بدستور کھڑے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔

میں خیالات میں کھو گیا۔ یہ کون ہے؟ اسے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔ اب میں یہاں روز آیا کروں گا۔ عجیب شان ہے اس میں، کچھ بے پروائی سی، غرور سا، یہ

جو مجھے اتنے دنوں سے رنگ برنگے خواب دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں یہ اُن ہی کی تو تعبیر نہیں، بھلا خواب بھی سچّے ہوئے ہیں کہیں؟ مگر اس کے ساتھ یہ چُغد سا لڑکا کون ہو سکتا ہے؟ اس کا بھائی ہو گا۔ لیکن اس کا بھائی بدشکل تو نہیں ہونا چاہئے۔ خیر کوئی ہو گا۔ یہ رہتے کہاں ہیں؟ میں چونک پڑا۔ ایک موڑ پر سائیکل اس بے ڈھنگے طریقے سے موڑی تھی کہ اگر ذرا اِدھر اُدھر ہو جاتی تو نیچے کھڈ میں ہوتا۔ میں سنبھل گیا۔ رفتار تھوڑی کر دی، ہیٹ اُتار لیا اور مزے مزے سے چلنے لگا۔

یکایک میں نے ایک موڑ پر دیکھا کہ ایک لمبی سی کار نچلی سڑک پر آ رہی ہے۔ میں نے رفتار اور آہستہ کر دی۔ اگلے موڑ پر اُسی کار کو پھر دیکھا۔ ایک جگہ تو میں نے اُونچا ہو کر دیکھ ہی لیا کہ کار میں ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ شاید وہی نہ ہوں۔ ذرا سی دُور جا کر دیکھا تو واقعی وُہ دونوں ہی تھے۔

اب بہت جلد کار یہاں سے گزرے گی اور اگر میں موٹر سائیکل پر ہوا تو اچھی طرح نہ دیکھ سکوں گا۔ لہٰذا اب اسے ٹھہرا لیا جائے۔ چنانچہ میں اُتر گیا۔ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے بظاہر اُس کی کچھ مرمت کرنے لگا۔ کار آئی اور میرے پاس ٹھہر گئی۔ لڑکا کھانستے ہوئے جھانک کر بولا۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

"جی نہیں، شکریہ! میں ابھی اسے ٹھیک کئے لیتا ہوں۔"

"آپ اسی راستے سے جائیں گے نا؟"

"جی ہاں!"

"تو پھر ہمارے ساتھ ہی آ جایئے۔ ویسے بھی شام ہو چکی ہے۔ خواہ مخواہ دیر ہو جائے گی آپ کو!"

مگر میں اس کے لیے تیار نہ تھا کہ بات یہاں تک بڑھ جائے۔ بھلا کون اچھی بھلی تندرست موٹر سائیکل کو کار میں لادے۔ خیر میں نے موٹر سائیکل کو پیچھے رکھا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور وُہ دونوں آگے بیٹھے تھے۔ موٹر شور مچاتی جارہی تھی۔

"معاف کیجیے! میں باتیں نہیں کر سکتا۔" میں نے زور سے کہا۔

وُہ دونوں ہنس پڑے۔ لڑکی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ شفق کی گلابی روشنی سے اس کا حسین چہرہ جگمگارہا تھا۔ میں سرکتا سرکتا سیٹ کے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ جہاں سے میں اُسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اُنہیں اپنا پتہ بتایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وُہ ہمارے ساتھ ہی پہاڑ کے دوسری طرف رہتے ہیں۔ وُہ مجھے ہماری کوٹھی پر اتار گئے۔ لڑکے نے کبھی پھر آنے کا وعدہ کیا۔

ہماری کوٹھی پہاڑ کے اس طرف تھی اور کافی بلندی پر ہونے کی وجہ سے چوٹی سے بالکل نزدیک تھی۔ یہ چوٹی بھی عجیب سی تھی۔ نہ نوکدار، نہ بے قاعدہ، بلکہ بالکل ہموار۔ جو تنگ سی سڑک ہمارے نزدیک سے گزرتی اور آبشاروں اور کُنجوں سے بچتی ہُوئی تڑمُڑ کر اُوپر چڑھتی، وُہ چوٹی کے عین اُوپر سے گزرتی اور گزرتی بھی اس طرح کہ چلنے والا کچھ راستہ بالکل چوٹی کے اوپر چلتا دکھائی دیتا اور پھر آہستہ آہستہ دوسری طرف اُتر جاتا۔

چوٹی کی بلندی پر سڑک کے کنارے ایک خوبصورت سا صنوبر کا درخت کھڑا تھا۔ یوں تو درخت وہاں اور بھی تھے لیکن وُہ سب سے نمایاں اور تنہا تھا۔ اُس کی ہر وقت ہوا کے جھونکوں سے سرگوشیاں کرتی رہتیں۔ غروبِ آفتاب کے وقت یہ درخت بہت ہی بھلا دکھائی دیتا۔ جب پہاڑ کے پیچھے سارا آسمان شفق کی سُرخی سے جگمگا رہا ہوتا تو اُس درخت کا سایہ نہایت ہی اچھا لگتا اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ کون زیادہ دلفریب ہے؟ شفق کی جھلک؟ یا سائے کی سیاہی!

شام کے وقت پرندوں کے غول کے غول درخت کے اُوپر سے اُڑتے ہوئے پہاڑ کی دوسری طرف جاتے۔ سُورج کی نارنجی شعاعوں سے اُن کے پَر چمکنے لگتے تو یوں لگتا جیسے جانوروں کے پَرے کے پَرے کسی دوسری دُنیا کی جانب پرواز کر رہے ہوں۔

پہاڑ کی دوسری طرف اُترتے ہوئے وُہ سڑک صرف دو تین کوٹھیوں تک ہی جاتی تھی۔ اس لیے شاذ و نادر ہی وہاں سے گزرتا۔ لیکن جب میں شام کو تھک کر جھرنے کے کنارے ایک اونچے سے پتھر پر بیٹھا ہوتا تو میری نگاہیں خود بخُود اُس اکیلے صنوبر کے درخت کی طرف چلی جاتیں اور اگر اس وقت کوئی چوٹی کو عبور کر رہا ہوتا تو اُس کا سایہ عجیب لگتا۔ ننّھا سا سایہ دیر تک ہلتا رہتا۔ یوں لگتا جیسے کوئی بے چین رُوح سکون تلاش میں بھٹک رہی ہو اور اُسے کہیں ٹھکانہ نہ ملتا ہُو۔ پھر آہستہ آہستہ سایہ غائب ہو جاتا اور صنوبر کا درخت اکیلا رہ جاتا۔

شام کو میں عموماً دو سائے دیکھا کرتا۔ ایک چھریرا سا جس کی قدم قدم میں موسیقی ہوتی، اُمنگیں ہوتیں، رقص ہوتا اور ساتھ ہی ایک بے ڈھنگا سا سایہ جس کی لنگڑاہٹ اور بھی نمایاں ہو جاتی۔ پہاڑ کے اس طرف وادی تھی۔ اتنی وسیع کہ جس کا کوئی اندازہ ہی نہ ہوتا تھا۔

اُودے اُودے پہاڑوں کے لہریے۔ سُرخ اور قرمزی پتھروں کے چمکتے ہوئے ڈھیر، ہریالے کُنج، خودرَو پھولوں کے رنگ برنگے تختے۔ جیسے قالین بچھے ہوں۔ چمکیلی شفاف ندیاں جو کبھی ایک دوسرے سے ملتیں اور کبھی جُدا ہو جاتیں۔ اور بھورے بھورے بادل جو ہمیشہ اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے رہتے۔ بارش کے بعد یہ رنگین نقوش اور بھی نمایاں ہو جاتے اور دُور تک گلکاری ہی نظر آتی۔ لیکن یہ وادی اتنی بڑی تھی کہ اُس کی وسعت میری نگاہوں کی پہنچ سے باہر تھی۔ ذرا سی دُور کے بعد یہ نقوش دھندلے ہونے شروع ہو جاتے اور پھر زمین اور آسمان مل کر افق بنا دیتے۔ اس کے آگے کچھ نہ دکھائی دیتا۔ جب رات کو آسمان صاف ہوتا اور پہاڑوں کا چاند چمکتا تو چاندنی اس نظارے پر ایک روپہلی اور مدھم سا ملمع کر دیتی۔ لمبے لمبے چیڑ کے درختوں کے سایوں کا اضافہ اور ہو جاتا اور چاندنی اور سائے ایک دوسرے کو اس طرح نمایاں کرتے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ کون زیادہ دلفریب ہے۔ چاندنی یا سائے؟

دوسرے تیسرے روز اُن کا نوکر آیا کہ وُہ اپنی کار ہمارے گیراج میں رکھ لیں کیونکہ اُن کا گیراج شکستہ حالت میں تھا۔ ہم نے اجازت دے دی۔

دو تین روز تک تو کار نہ آئی۔ پھر ایک دن دیکھا کہ وُہ سب کے سب کار میں نیچے گئے۔ میں سارا دن انتظار کرتا رہا کہ کب واپس آتے ہیں۔ خُدا خُدا کر کے شام کو واپسی ہُوئی اور نچلی سڑک پر کار آتی دکھائی دی۔ اُس دن میں خاص طور پر بن سنور کر تیار تھا۔ کار میرے پاس سے گزری۔ وُہ بھی تھی، اگلی سیٹ پر شاید اس کے ابّا تھے۔ میں نے سلام کیا۔ اُنہوں نے مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ بد قسمتی سے شوفر کار چلا رہا تھا۔ وُہ سیدھا ہی لے گیا اور میں چپ چاپ واپس آ بیٹھا۔ ذرا سی دیر میں شوفر کار واپس لایا اور چھوڑ کر پیدل چلا گیا۔ یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ میں نے دل میں سوچا یوں تو یہ کبھی یہاں آئیں گے ہی نہیں۔

دوسری تیسرے دن سیر کر کے واپس آیا تو ڈرائنگ روم میں خوب قہقہے پر قہقہے لگ رہے تھے۔ جھانک کر دیکھا تو وہی صاحب بیٹھے تھے جنہیں میں اُس لڑکی کا باپ سمجھا تھا۔ چچا ابّا سے بڑی بے تکلّفانہ باتیں ہو رہی تھیں۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ چچا ابّا نے میرا تعارف کرایا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وُہ دونوں کبھی کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ اُنہوں نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا اور بولے کہ تمہاری ہی عمر کا میرا ایک بھانجا آیا ہوا ہے وُہ تم سے مل کر بہت خوش ہو گا۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ وُہ کمبخت جھڑوس بھانجا ہے ان کا، طبیعت پر اوس پڑ گئی۔

باتیں کرتے ہوئے وُہ ایک نام بار بار لیتے تھے۔ یہ نام کشور تھا۔ مجھے اُلجھن سی ہو گئی آخر کون کشور؟ پتہ بتاتے نہیں اور یُونہی باتیں کئے جا رہے ہیں کشور کی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں پوچھ بیٹھا کہ صاحب یہ کشور کون ہیں؟ معلوم ہوا کہ ان کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ اور ان کی چھٹیاں ابھی ابھی شروع ہُوئی ہیں۔

تو گویا یہ وہی ہے جسے میں نے سینما میں دیکھا تھا۔ کشور نام میں بھی شان ہے۔ بالکل ویسی ہی شان! پورا نام کیا ہو گا؟ کشور جہاں! کشور سلطان! شاید کشور آرا۔ نہیں نہیں! لاحول ولا قوۃ! یہ نام تو کچھ نہیں۔ یونہی لگتا ہے۔ بس صرف کشور ہو گا اور یہی اچھا بھی لگتا ہے۔

رات بھر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ نام کتنا حسین ہے۔ بالکل نام والی کی طرح! اس کے بعد ہمارے اور ان کے دوستانہ تعلقات بڑھتے گئے۔ کتنی ہی دفعہ تحائف آئے اور بھیجے گئے۔ کتنی دفعہ وُہ ہمارے ہاں آئے اور ہم اُن کے ہاں گئے۔ پھر اکٹھے پروگرام بننے لگے۔ پارٹیاں ہوئیں۔ پکنک کئے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہم آپس میں خوب گھل مل گئے۔

اُن کا وُہ فضول بھانجا مجید بُری طرح مجھ سے چمٹ رہا تھا۔ جتنا وُہ میری جانب ملتفت ہوتا اُتنا ہی میں کتراتا۔ مجھے وُہ ایک آنکھ نہ بھاتا۔ میں ہمیشہ اس سے

بے رُخی برتتا۔ اُدھر کشور تھی کہ مجھ سے اتنی ہی دُور تھی جتنی ہمارے میل جول سے پہلے۔ اُس کی وہی شان بدستور تھی۔ بعض اوقات تو وُہ مجھے مغرور لگنے لگی۔

کہیں آمنا سامنا ہوا۔ سلام کیا تو ہلکے سے اشارے سے جواب دیا اور چل دیں۔ کسی دروازے سے گزریں گی، آگے بڑھ کر کواڑ کھول دیا اور تھامے رکھا۔ بس سر کو ذرا جنبش دی، مُسکراتے ہوئے ہونٹ ذرا اور مُسکرانے لگے۔ گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔ کبھی چرمی بیگ رہ گیا یا بیڈمنٹن کے بعد اپنی ننھی مُنّی سی گھڑی بھول گئیں۔ دوڑ کر پکڑا دی۔ دیکھ کر مُسکرا دیں، بس ختم! جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ نہ شکریہ نہ کچھ! میں تنگ آ چلا تھا اس ہر وقت کی مُسکراہٹ سے۔ اگر بولیں گی بھی تو عجب بے نیازی سے جیسے کوئی بہت بڑا مدبّر بول رہا ہو۔ کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہو۔ لمبے لمبے سے سوال پوچھ لو مگر جواب وہی دو تین حروف کا ملے گا۔ وُہ بھی بڑے سوچ بچار کے بعد اور ہلکی سی آواز میں۔

کافی دنوں کے بعد یہ رویّہ بدلا۔ پھر آہستہ آہستہ جھجک یا کھچاؤ جو کچھ بھی تھا دور ہوتا گیا۔ اُسے میرے مشاغل میں دلچسپی ہوتی گئی۔ اب نہ صرف سلام کا باقاعدہ جواب ملتا بلکہ عموماً پہل بھی اس کی طرف سے ہوتی۔ ایک دن سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ زندگی میں سب سے بڑی آرزو کیا ہے۔

مجید کی باری آئی تو سب کے سب ہنس پڑے۔ وُہ بے چارہ شرما کر رہ گیا۔

"بھئی میں بتاؤں تمہارے دل کی بات؟" میں نے کہا۔ "ان کی آرزو ہے کہ ساری دُنیا میں ایک زبردست قحط پڑے اور سب کے سب دُبلے پتلے مریل سے ہو جائیں۔ چڑچڑے زود رنج اور خشک اور یہ خُشکی پھیلتی پھیلتی یہاں تک بڑھ جائے کہ کرہ ارض پر خُشکی کے سوا کچھ ہو ہی نہیں۔"

"اور جو کوئی ہنسے تو گرفتار کر لیا جائے۔ بس رونا پیٹنا ہی سُنائی دے ہر طرف۔" کشور نے کہا۔

ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

اب کشور کی باری تھی۔ وُہ بولی۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ خوب سُرخ سا گول مٹول چہرہ ہو جائے اور بے تحاشا وزن بڑھ جائے۔ ایسی تندرست ہو جاؤں کہ بس لوگ دیکھا کریں۔"

میں نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ لڑکیاں تو ہر وقت دُبلا ہونے کی فکر میں رہتی ہیں اور یہ ہیں کہ بالکل اس کا جواب نہیں! یہ بھی نہیں کہ دبلی پتلی ہوں۔ اپنی بہنوں میں سب سے تندرست اور خوش مزاج!

آرزو بھی بتائی تو کیا بتائی۔ اچھا اس کا مضحکہ اڑایا جائے گا۔

اب سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میرا آخری نمبر تھا۔ میں نے عجب بے نیازی سے کہا۔ "صاحب میرا تو یہی جی چاہتا ہے کہ کسی دن فوج میں کپتان بنوں۔ سر پر نوکدار ٹوپی ہو۔ بازو پر سٹار لگے ہوں۔ کیا شان ہوتی ہے وردی کی؟"

اُسی دن میں نے سوچ سانچ کر ایک تصویر بنائی۔ ایک گول مٹول سُرخ سی گڑیا۔ موٹے موٹے ہاتھ پاؤں، فٹ بال جیسا چہرہ، نیچے لکھا۔ ایک خاتون آج سے دو سال بعد!

یہ تصویر کشور کو دے دی۔ اُس نے لے لی۔ ایسے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔

شام کو مجھے ایک تصویر ملی۔ ایک لمبا سا بانس نما آدمی جس کے کندھے پر گھوڑے کی زین تھی اور سر پر ایک پھٹا پُرانا بستر جس میں ٹوٹی پھوٹی تلواریں، بندوقیں اور پستول ٹھُسے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں ایک لٹھ تھا جس پر ایک نوکدار ٹوپی رکھی تھی۔ پیچھے پیچھے ایک مریل سا بِد نُما گھوڑا جسے ایک خاکی رنگ کا کوٹ اور برجس پہنا رکھی تھی۔ کوٹ کے بازو پر سٹار لگے ہوئے تھے۔ نیچے لکھا تھا۔ "آج سے تین چار سال بعد کے ایک فوجی کیپٹن۔"

میں جھینپ گیا اور تہیّہ کر لیا کہ اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ پھر اُس نے ایک دن ایک مذاق کا رُخ میری طرف کر دیا۔ میں اُسے سزا دینے کے لئے ایک فرضی لطیفہ سُنانے لگا۔ "سُنئے ایک روز ایک جگہ ایک موٹی سی خاتون آئیں (اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ پگلی کبھی کی۔ وُہ خود تو موٹی نہیں تھی بالکل۔ بس آرزو ہی تھی نا) جی ہاں ایک موٹی تازی خاتون آ گئیں اور تانگے پر سوار ہونے لگیں۔ تانگے والے سے سودا ہونے لگا۔ وُہ بولا۔ خُدارا آپ جلدی سے بیٹھ جایئے۔ کہیں گھوڑا آپ کو دیکھ نہ پائے (قہقہہ)۔ خیر تو وُہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ یقین مانئیے کہ گھوڑا ہوا میں معلّق ہو گیا (قہقہہ)۔ تانگے والا کُودا اور خاتون سے نیچے اُترنے کے لئے لیے التجائیں کرنے لگا۔ خُدا خُدا کر کے وُہ اُتریں۔ اب جو آگے بیٹھی ہیں تو بس گھوڑا اکڑوں بیٹھ گیا۔" کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"تو کیا بہت موٹی تھیں وُہ خاتون؟" کسی نے سوال کیا۔

"ہاں کچھ تھیں بھی۔ مگر کچھ اتنی مرٹی بھی نہیں تھیں۔ البتہ موٹا ہونے کی کوشش ضرور کر رہی تھیں۔"

سب کے سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وُہ مُسکرا کر بولی۔ ”مجھے ایک خواب یاد آ گیا۔ پرسوں صُبح نظر آیا تھا۔ شاید صُبح صادق کے خواب سچّے ہوتے ہیں نا۔ میں نے دیکھا جیسے ایک اونچا سا کلاک ٹاور ہے۔ اس کے نیچے بہت سے آدمی کھڑے ہیں۔ اچھا ہجوم سمجھ لیجیئے۔ ایک غُل مچا ہوا ہے۔ لوگ ٹاور کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کلاک آدھ گھنٹہ پیچھے ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ کسی آدمی کو اُوپر بھیجو، کوئی کہتا تھا کہ سیڑھی منگواؤ۔ اتنے میں ایک سیاہ رنگ کی لمبی کار رُکی (ایسی ہماری کار تھی) اور ایک لمبا سا لڑکا کالج کا بلیزر پہنے نکلا۔ اپنی گھڑی دیکھی پھر کلاک دیکھا اور لوگوں سے بولا۔ ’اتنی سی بات ہے یہ لو‘۔ یہ کہہ کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے ہاتھ اُونچا کیا۔ میں جھُوٹ نہیں بول رہی۔ نہ جانے پہلے سے وُہ اتنا لمبا تھا یا اُسی وقت لمبا ہو گیا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے کلاک کی سوئیاں ٹھیک کر دیں۔ لوگ اُسے اپنی پگڑیاں سنبھال کر دیکھ رہے تھے۔ بچّے بے ہوش ہو گئے۔ عورتیں چیخیں مارنے لگیں۔ غُل مچ گیا۔ پکڑنا، لینا، یہ کیا بلا ہے؟ لڑکے نے جب یہ حال دیکھا تو سیٹی بجاتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا نظروں سے غائب ہو گیا۔“

اب سب کے سب میری طرف دیکھ کر بُری طرح ہنسنے لگے۔ میں جھینپ گیا۔

”بھئی یہ تو چسپاں کر دی۔“ کوئی بولا اور مجھے اپنے چھ فُٹے قد کا احساس ہونے لگا۔

پھر ایک دن میں باہر ایک سینری بنارہا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔

کشور میرے ساتھ بیٹھی جھک کر تصویر دیکھ رہی تھی۔ اتنے قریب سے کہ اُس کا گرم گرم معطّر سانس میرے رُخساروں کو چھُو رہا تھا۔ میرا چہرہ جل رہا تھا۔۔۔ میری انگلیاں کچھ کچھ کانپ رہی تھیں۔

"کہیں آسمان بھی سبز ہُوا ہے؟" وُہ بولی

"یہ سبز ہے کیا؟"

"سبز نہ سہی، سبزی مائل سہی۔ اس قسم کے آسمان دیکھنے کا ہمیں تو کبھی اتّفاق نہیں ہُوا۔ خیر! مگر یہ درختوں کی چوٹیاں کب سے گلابی ہونا شروع ہوئیں۔"

"شفق کی جگمگاہٹ سے گُلابی ہو گئیں۔" میں نے کہا۔

"شفق کہاں دھرا ہے اس وقت؟"

"تمہارے چہرے کا جو عکس پڑ رہا ہے۔"

میں نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ اُس کا گلابی چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"یہ لیجئے ساری تصویر ہی سُرخ ہو گئی۔" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

اُدھر مجید سے خوب چھن رہی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ وُہ کشور کا منگیتر ہے اور منگنی بھی مدّتوں کی ہے۔ میں ہمیشہ اُس کا مذاق اُڑایا کرتا اور مذاق بھی اتنے کھلے الفاظ میں کہ شاید اور کوئی ہوتا تو ناراض ہی ہو جاتا۔ لیکن کیا مجال جو اس کی پیشانی پر بل بھی آیا ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اُسے اس قابل ہی نہ سمجھتا تھا کہ وُہ کشور سے محبّت کرے۔ میں اُسے صاف صاف کہا کرتا کہ ''تم کتنے تنگ دل ہو؟ تمہارا دل کتنا چھوٹا سا ہے۔ بالکل چڑیا کے بچے جتنا، تم کتنے خود غرض ہو۔ تُم ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ محض اس لئے کہ وُہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ محض اس لئے کہ وُہ تمہارے عزیزوں میں سے ہے اور تمہارے بس میں ہے اور اس لڑکی کی انتہائی بد قسمتی ہے۔ وُہ عجب مخمصے میں پھنسی ہے اور بول بھی نہیں سکتی۔''

وُہ ہنس کر کہتا۔ '' بھیّا میرے پاس تو لے دے کے یہی سہارا ہے۔ اگر میں خوبصورت ہوتا تو بھی اسی طرح ناز برداریاں کرتا اور اگر خوبصورت نہیں ہوں تب بھی ہمیشہ یہی کروں گا۔ شکل و صورت تو خُدا کی دی ہوئی ہے۔ اس میں کسی کا بس نہیں۔ باقی رہا دل۔ سو اس میں کشور کا جس قدر احترام ہے اس کی کوئی انتہا نہیں اور یہ ہمیشہ اسی طرح رہے گا۔''

"مگر مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اگر تمہارے دل نہایت تنگ ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی وُسعت ہوتی تو تم کشور کی زندگی تباہ نہ کرتے۔ بھلا شکل و صورت کا فرق کیوں نہیں پڑتا اور پھر اُس صورت میں جب ایک بہت ہی حسین ہو اور دوسرا بہت ہی بدشکل۔"

جب میں اُسے بدصورت کہتا تو ہنس کر ٹال دیتا۔ لیکن پھر جیسے اُسے کچوکے سے لگنے لگتے۔ اس کے بدصورت چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو جاتے۔ ہونٹ لرزنے لگتے۔ آنکھیں اور بھی ڈراؤنی ہو جاتیں جو دھندلی پڑ جاتیں۔ لیکن وُہ بڑے ضبط سے آنسو روک لیتا۔ لیکن شاید اکیلے میں نہ روک سکتا ہو۔

یہ زیادتی میں ہر دوسرے تیسرے روز کرتا لیکن اُس نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ کئی دفعہ تو مجھے اس پر رحم آنے لگتا اور میں تہیہ کر لیتا کہ اب اُسے کچھ نہ کہوں گا۔ لیکن نہ جانے وُہ کون سا جذبہ تھا جو مجھے اُسے چھیڑنے پر مجبور کر دیتا۔ بعض اوقات تو میں اُسے ایسے الفاظ سے مخاطب کرتا کہ بعد میں گھنٹوں پچھتاتا۔ وُہ ہمیشہ مسمی شکل بنا کر کہتا۔ "تم دیکھ لینا میں اُسے حسین سے حسین لڑکوں سے زیادہ خوش رکھوں گا۔ میری زندگی کا لمحہ لمحہ اُس کی خدمت کے لیے وقف ہو

گا۔ شکل صورت کا کیا ہے؟ یہ چاؤ تو تھوڑے دنوں کا ہوتا ہے۔ خلوص ہمیشہ رہتا ہے۔ مجھ میں خوبصورتی نہ سہی خلوص تو ہے!"

میں چڑ کر کہتا "تم میں دونوں غائب ہیں۔"

جب ہم سیر کو نکلتے یا سینما جاتے تو مجید بجھ بجھ جاتا۔ کشور کو خوش کرنے کے لیے وُہ کس قدر کوشش کرتا۔ ایک دفعہ کشور نے پھولوں کے ایک گچھے کی تعریف کی جو کھڈ کے دوسری طرف تھا۔ ذرا سی دیر میں مجید غائب ہو گیا اور کئی گھنٹوں کے بعد جب آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی گُچھّا تھا اور لبوں پر ڈراؤنی سی مُسکراہٹ۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور جسم لہو لہان۔ نہ جانے بے چارہ کِن کِن مُشکلوں سے کھڈ میں اترا ہو گا۔

کئی دفعہ دیکھا کہ مجید صاحب کے اوسان خطا ہیں، ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ وجہ پوچھتے ہیں تو پتہ چلتا کہ کشور کے سر میں درد ہے۔ یہ صاحب ہیں کہ دس میل پرے ڈاکٹر کے ہاں کئی کئی چکر لگاتے ہیں۔ گھڑی گھڑی میرے پاس آ رہے ہیں۔ طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔

ایک دن میرے پاس گھبرایا ہوا آیا۔ ذرا ہی دیر بیٹھا ہو گا کہ چکرا کر گر پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کشور کی طبیعت خراب تھی اور مجید نے پوری دو راتیں بغیر

سوئے گزار دی تھیں۔ اُس کی باتیں بھی عموماً کشور کے متعلق ہی ہوتیں۔ وُہ نہایت ادب سے اس کا نام لیتا جیسے اپنے سے بڑے کا ذکر ہو رہاہ۔

آج کشور وہاں گئی تھیں۔ انہوں نے یہ کہا۔ وُہ کل یہاں آئیں گی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ اُسی کا نام لے لے کر زندہ ہے اور کشور نہ صرف اس کی زندگی کا جزو بن چُکی ہے بلکہ شاید اس کی روح کا بھی۔ لیکن یہ میں کبھی نہ سمجھ سکا کہ آیا کشور بھی اس سے محبّت کرتی تھی یا نہیں۔ وُہ بڑی تمکنت سے اس کی باؤلی باتوں کا جواب دیتی۔ اُس نے کبھی بے رُخی نہیں جتلائی اور نہ ہی کبھی میں نے اُسے مجید کے ساتھ ہنستے دیکھا۔ جب وُہ اس کے ساتھ ہوتی تو بالکل چُپ چاپ سی رہتی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ اس وقت وُہ کسی حد تک سنجیدہ لگا کرتی۔

اگرچہ مجید قابلِ رحم تھا اور اتنا زیادہ بُرا بھی نہیں تھا جتنا مجھے لگتا۔ لیکن نہ جانے ایک حسین ہستی کے ساتھ چلنے میں اس کی بدصورتی اور نمایاں ہو جاتی۔ اُس کی یہ جرأت مجھے چبھنے لگتی۔ کیونکہ کشور آہستہ آہستہ میری زندگی پر چھارہی تھی۔

مجید بعض اوقات میرے مضبوط بازوؤں کو اپنی سُوکھی ہوئی انگلیوں میں لے کر کہتا۔ ”کیا ہوا جو مجھ میں طاقت نہیں، میرا جسم اتنا خوبصورت نہ سہی۔ لیکن تمہارا

تو ہے۔ میرے لئے یہ بات کیا تھوڑی ہے کہ میرے عزیز دوست کی شخصیّت اس قدر ممتاز ہے۔“

یہی الفاظ کسی اور کے مُنہ سے سُن کر شاید میں پھُولا نہ سماتا۔ لیکن اُس کی زبان سے مجھے یہ اعترافِ شکست معلوم ہوتا۔ اگر میں کہہ دوں کہ میں انتہائی خُودغرضی سے کام لیتا تھا تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ میری باتوں کا اثر تھا کہ اُسے ہر وقت اپنی بدصورتی کا خیال رہنے لگا۔ شاید وُہ مجھے دیکھتے ہی اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگتا۔ کئی دفعہ وُہ بچّوں کی طرح مچل جاتا اور مجھ سے پوچھتا۔

”ایک بات بتاؤ گے ؟ کیا میں سچ مُچ اتنا بدصورت ہوں جتنا تم کہتے ہو۔“

میں کہا ”ہاں سچ مُچ!“

وُہ بڑی بے بسی سے کہتا ”تو اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا میں ہمیشہ اسی طرح رہوں گا؟“

میں سر ہلا کر کہتا۔ ”ہاں اسی طرح رہو گے۔“

”تو کیا میں کسی کی محبّت کے قابل نہیں ہو سکتا؟“

میں ہنس کر تلخ لہجہ میں کہتا۔ ”کیا محبّت محبّت کرتے رہتے ہو تم ہر وقت؟ تم سے کِس مسخرے نے کہا ہے کہ ضرور محبّت کرو۔ اگر ایسی شکل خُدا نے دے دی۔ تو صبر کر کے بیٹھ رہو۔ یا کسی اپنے جیسی بدصورت سی لڑکی سے محبّت کرنے لگو۔ شاید وُہ بھی اسی تلاش میں ہو۔ مگر لِلّٰہ خوبصورت لڑکیوں کا خیال چھوڑ دو۔ یہ خلوص وغیرہ وغیرہ باتیں ہیں۔ تم کبھی کسی حسین لڑکی کو خوش نہیں رکھ سکو گے۔ میں لکھ دوں!“

وُہ میرے شانے پر اپنا سر رکھ دیتا اور بڑی بے بسی سے رونے لہجے میں کہتا۔ ”میرے اللہ! مَیں کیا کروں؟ کیسے اپنے پگلے دل کو سمجھاؤں؟ میرے لیے تو دُنیا میں اگر کوئی جاذبیت ہے تو وُہ کشور ہے۔ اگر اُسے میری زندگی سے نکال دیا جائے تو شاید اس میں کوئی دلچسپی رہے۔ بھلا اس میں میرا قصور کیا ہے؟ کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ میں اتنا بدصورت نہ ہوتا؟“

کبھی کبھار ایک مبہم سا خیال میرے دل میں آتا ہے۔ شاید کشور کو مجید کا کوئی خیال نہ ہو۔ اور اگر کسی دن یہ مجید کی پہنچ سے باہر ہو گئی تو کیا ہو گا؟ دُنیا میں ہماری زندگی کا دارومدار ان خطوط پر ہے۔ جنہیں تقدیر کا ہاتھ اندھا دُھند کھینچ رہا ہو۔ بہت سے خطوط ایک دوسرے کے متوازی ہوتے ہیں اور ہمیشہ دُور دُور سے آ کر

ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔ اور یہ کسے پتّہ کہ کب اور کہاں کِس کا خط کِس کے خط کو قطع کرے گا۔

شام کا وقت تھا۔ میرے سامنے برفانی چوٹیاں سُورج کی آخری شعاعوں سے جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ کشور میرے قریب بیٹھی مجھے طرح طرح کے مشورے دے رہی تھی۔ جن پر اگر میں عمل کرنے لگتا تو تصویر کچھ کی کچھ بن جاتی۔ میں اُس کی لگاتار باتوں سے تنگ آ چلا تھا۔ مگر یہ بھی چاہتا تھا کہ وُہ پاس بیٹھی رہے۔

کار کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ مجید کار چھوڑ کر واپس جا رہا تھا۔ وُہ مجید کو دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"اُن کے ساتھ!"

"اتنی جلدی کیا ہے، ٹھہر کے سہی۔"

"مگر یہ جو جا رہے ہیں۔" وُہ بولی۔

"بھئی میں تمھیں چھوڑ آؤں گا۔"

"نہ جانے آپ کو ان فضولیات سے کب فرصت ملے؟ کیسے الٹے سیدھے مشغلے ہیں آپ کے بھی!"

میں چِڑسا گیا۔

"اچھا اب بیٹھ جاؤ۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی چلے چلیں گے۔" میں نے کہا۔

"مگر وُہ بھی تو اکیلے ہی جارہے ہیں۔"

"راستہ تو نہیں بھُول جائیں گے وُہ۔" میں نے ذرا تلخی سے کہا۔

"اچھا تو خدا حافظ!" وُہ چلتے ہوئے بولی۔ میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ کشور کے اشارے سے مجید بھی ٹھہر گیا تھا۔

"کشور کوئی ہرج نہ ہو تو اگر تم میرے ساتھ چلتیں۔"

میری اُنگلیوں سے بُرش چھوٹ کر گر پڑا۔ وُہ جارہی تھی۔ مجید سامنے سڑک پر کھڑا تھا۔ وُہ جیسے مجھ پر ہنس رہا ہو۔ اس کی آنکھیں میرا مضحکہ اڑا رہی تھیں۔

جب میں واپس آیا تو مجھے کچھ غصّہ بھی آرہا تھا اور کچھ ہنسی بھی۔ کھسیانی ہنسی جو کہ عموماً ہارنے کے بعد آیا کرتی ہے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سیاہی سے چہرے پر

مونچھیں اور داڑھی بنائی۔ پھر اپنی شکل دیکھ کر خوب مُسکرایا۔ لو مولانا، اسی شکل پر ناز تھا؟ اب مزے کرو۔ وُہ چُغد تم سے کہیں حسین ہے۔ آخر تم ہو کیا بلا؟ آخر کیوں ہو کسی کو تمہارا خیال؟ تم اُس کے لگتے کیا ہو؟ بیوقوف کہیں کے، مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو۔ اور وُہ ہوتا ہے سب فضول ہی۔ مفت میں ہوائی قلعے بناتے رہتے ہو۔ اور پھر تمہیں کم کیا ہے؟ سارے دن بندوق اُٹھائے جنگلوں میں پھرنا، چشموں میں چھلانگیں لگانا، اُلٹی سیدھی تصویریں بنانا اور جہاں کوئی اچھّی شکل دکھائی دی گھنٹوں وہیں کھڑے رہنا۔ واقعی نہایت ہی اوٹ پٹانگ مشغلے ہیں آپ کے۔ مجید سمجھ دار ہے۔ وُہ اُس کا زندگی بھر کا ہونے والا ساتھی ہے۔ تمہاری طرح لاپروا اور احمق نہیں ہے۔ وُہ اُس کے لیے سب کچھ ہے۔۔ مگر۔۔۔ مگر میں کوچ پر گر پڑا۔ کیا وُہ فضول مجید کشور کو اپنا بنا لے گا؟

کشور کی آنکھیں، اُس کی لمبی لمبی پلکیں، وُہ گلاب کی پتّیوں جیسے شگفتہ ہونٹ کسی اور کے ہو جائیں گے؟ اُس حسین مجسمے کے ساتھ کوئی اور چلا کرے گا؟

زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کیا۔ میں مجید کو ہارا ہوا سمجھا کرتا اور اسی لئے اسے اتنا کمتر سمجھتا۔ لیکن کون ہارے گا کون جیتے

گا۔ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اور پتہ بھی کیسے ہو، زندگی کے خطوط کے کھیل کو کون جانتا ہے؟ کہ کب دُور ہو جائیں گے۔

کیوں نہ اس شکست کا استقبال مُسکراتے ہوئے کیا جائے؟

تیسرے روز ہی کشور کی سالگرہ تھی۔ میرا جی نہ چاہتا تھا کہ کوئی تحفہ بھیجوں اور بھیجتا بھی کِس مُنہ سے؟ اُس کی امّی ہمارے ہاں آئیں اور چلتے ہوئے بولیں: ”تمہیں پتہ ہے کل کشور کی سالگرہ ہے۔“

”ارے؟ سالگرہ ہے! سچ مُچ!“ میں نے مکاری سے کہا۔ ”کیا تحفہ بھیجوں اُس کے لئے؟“

”بھئی یونہی کوئی چھوٹی موٹی سی چیز بھیج دینا۔ مثلاً کوئی اپنی بنائی ہُوئی تصویر ہی بھیج دینا۔“

اُنہوں نے ایک سینری کو پسند کیا۔

دوسرے روز تصویر بھیجتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس پر لکھوں کیا۔ میری وُقعت ہی کیا ہے اُس کی نگاہوں میں؟ آخر سوچ ساچ کر لکھا۔ ”اُس کی طرف سے جس سے تمہیں از حد نفرت ہے۔“

دوپہر کو ایک خط آیا جس میں لکھا تھا۔ "اُن کا بہت بہت شکریہ جن سے مجھے شدید قسم کی نفرت ہے اور شاید ہمیشہ رہے گی۔"

کچھ دن اور ہم نہیں ملے۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا رہا۔ بھلا اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ صاف صاف ہی تو کہہ دیا ہے اُس نے کہ نفرت ہے اور شدید قسم کی نفرت اور ہمیشہ رہے گی۔

دوسری شام کو میں اس پتھر پر بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ پہلی تصویر مکمل ہی نہ ہُوئی تھی۔ میں شفق پھُولنے کا انتظار کر رہا تھا۔ بد قسمتی سے اس دن عجیب بے ڈھنگے سے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اچھا خاصا اندھیرا ہوا چلا تھا۔ اتنے میں کوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا، بالکل چپکے سے۔ میں نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ یہ کشور تھی۔ میں نے ظاہر یہی کیا کہ جیسے مجھے پتہ ہی نہیں کہ کوئی آیا ہے۔ پھر وُہ جھک کر سینری دیکھنے لگی۔ اُس کا گرم معطّر سانس میرے رخسار سے چھُو رہا تھا۔ میرا چہرہ تمتما اُٹھا اور انگلیاں کانپنے لگیں۔ مگر میں نے اُس کی طرف نہیں دیکھا۔

"یہ رنگ پھر غلط بھر رہے ہیں آپ۔" وُہ بولی۔۔۔ میں چُپ رہا۔

"لائیے اپنے بُرش ادھر دیجئے۔ اتنے دن ہوئے تصویریں بناتے اور یہ بھی پتہ نہیں کہ پتھر گلابی نہیں ہوتے۔"

"روشنی پڑ رہی ہے۔" میں نے بسور کر کہا۔

"کہاں سے آگئی روشنی اس وقت؟ کتنا اندھیرا ہو رہا ہے؟"

"شفق کی روشنی ہو گی!"

"مگر یہ تو تصویر ہی گلابی ہو رہی ہے۔ ہر جگہ شفق ہی شفق ہے کیا؟"

"تو پھر کسی کے چہرے کا عکس پڑ رہا ہو گا۔" میں نے مُنہ بنا کر کہا۔

"کسی کے چہرے کا؟"

"کیا پتہ؟۔۔۔ ہو گا کوئی۔"

میں نے پھر کن انکھیوں سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں مُسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ میں بمشکل مُسکراہٹ ضبط کر سکا۔

"اب رہنے دیجئے۔ نِگوڑی انگلیاں بھی تھک گئی ہوں گی۔" وُہ بُرش چھینتے ہوئے بولی۔

"بھلا تمہیں ان اُنگلیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"اتنی زیادہ کہ شاید اس قدر آپ کو بھی نہ ہو۔" میں جیسے چونک پڑا۔ میں نے نزدیک سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ان کی گہرائیوں میں ایک طوفان بپا تھا۔

اور اُس رات بڑا زبردست طوفان آیا۔ کہتے ہیں کہ ایسا طوفان وہاں مدّت سے نہ آیا تھا۔ رات بھر کوئی آسمان اور زمین کو جھنجھوڑتا رہا۔ ہوا کے تیز تھپیڑوں نے بلندیوں سے بڑے بڑے پتھروں کو لڑھکا دیا۔ دیو قامت درختوں کو تنکوں کی طرح اُٹھا پھینکا۔ پانی کی تیز بوچھاڑ نے سب کچھ زیروزبر کر ڈالا۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے پانی کی دھار بہہ رہی تھی۔ نہ معلوم اتنا پانی کہاں سے آرہا تھا۔ ہوا چنگھاڑیں مار رہی تھی۔ جنگلوں سے خوفناک چیخیں سُنائی دے رہی تھیں۔ بجلی رہ رہ کر کڑکتی اور مہیب آواز کے ساتھ کہیں گرتی۔ سب کے سب سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ کھڑکیوں سے باہر پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ شاید ندیاں چڑھ آئیں تھیں۔ موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے طوفان کبھی ختم نہ ہو گا۔ سب کچھ بہہ جائے گا۔ کچھ نہ رہے گا۔

بجلی زور سے کڑکی اور ایک وحشت ناک آواز سُنائی دی۔ اتنی نزدیک تھی کہ میں برآمدے میں دیکھنے گیا۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ تھا۔ مجھے ایک ٹمٹماتی ہُوئی روشنی دکھائی دی جو نزدیک آتی جارہی تھی۔ کوئی شخص روشنی لئے آرہا تھا۔ ذرا سی دیر میں وُہ بالکل نزدیک آگیا۔ یہ مجید تھا۔ پانی میں شرابور، بھاری لبادے میں لپٹا ہوا، گرتا پڑتا آرہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ان کی چھت کا ایک حصّہ گر پڑا تھا اور ایک نوک دار لمبا سا لکڑی کا ٹکڑا کشور کی امّی کے بازو میں کھُب گیا تھا۔ اتنی دیر ہُوئی خون رُکتا ہی نہ تھا۔ وُہ سارے جتن کر چکے تھے۔ مجید مجھے لینے آیا تھا۔ کار جا نہ سکتی تھی کیونکہ ساری سڑک درختوں سے پٹی پڑی تھی۔ ویسے ہمارے ہاں سے بھی مجھے ایسے وقت باہر نکلنے کی اجازت دیتے ہچکچاتے تھے۔

بڑی مشکل سے مجھے اجازت ملی اور میں ایک لمبی سی برساتی اوڑھ کر باہر نِکلا۔ خُون منجمد کر دینے والی سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور جیسے بدن میں سے نکل گیا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔

پہلے پہل تو یوں لگتا تھا جیسے ہوا کے تیز جھکڑ ہمیں آگے نہ بڑھنے دیں گے مگر آہستہ آہستہ پھسلتے، لڑھکتے، لڑھکتے ہوئے ہم آگے سرکے۔ جب ہم چوٹی پر سے گُزرے تو مینہ کی بوچھاڑ اور طوفان نے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے مجید کا

بازو اپنے بازو میں لیا اور اُسے سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھا۔ دھیرے دھیرے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ہم دوسری طرف اُتر گئے۔ مجھے پتہ نہیں شاید وُہ اُس وقت بولنے کی کوشش کر رہا تھا یا شاید بول ہی رہا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہاں سب ہمارے منتظر تھے۔ کشور کی امّی کا بازو واقعی بہت بُری طرح زخمی ہوا تھا اور خُون بھی بہہ رہا تھا۔ ایک دفعہ تو میں گھبرا ہی گیا۔ کیونکہ لکڑی کا ٹکڑا نہ صرف بُری طرح کھُبا ہوا تھا بلکہ کچھ حصّہ اندر ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے لیے ایک چھوٹے سے آپریشن کی ضرورت تھی۔ میری ہمت جواب دینے لگی۔ پھر کچھ کچھ ڈھارس بندھی۔ محض کشور کی موجودگی سے۔ وہاں وہی تھی جو بالکل ہراساں نہ تھی۔ اس کے چہرے پر ذرا سی گھبراہٹ نہ تھی۔ وہی شان وہی تمکنت اور وہی مُسکراتے ہوئے ہونٹ۔ اگر وُہ وہاں نہ ہوتی تو میں سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیتا۔

اُس نے میرے ساتھ کھڑے ہو کر مجھے نشتر پکڑائے۔ بار بار میری پیشانی سے پسینہ پُونچھا۔ جو اس قدر سردی میں بھی مجھے آ گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی شگفتہ باتوں سے میری ہمّت بندھاتی رہی۔ خُدا خُدا کر کے یہ سب کچھ ختم ہوا اور میں نے لکڑی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے نکال کر زخم اچھی طرح باندھ دیا۔ ہاتھ دھوتے

وقت میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو طوفان ختم ہو چکا تھا اور صُبح کے آثار نمودار تھے۔

اور جب میں واپس آ رہا تھا تو کشور میرے ساتھ تھی۔ ہم چوٹی پر پہنچے وہاں صنوبر کا درخت جوں کا توں کھڑا ہوا کے جھونکوں سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ میں ایک اُونچے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ سامنے جھلمل جھلمل کرتی ہُوئی برفانی چوٹیوں سے سُورج طلوع ہو رہا تھا۔ ساری فضا دُھلی ہُوئی تھی۔ نِتھری نِتھری سی۔ مجھے وادی اتنی وسیع دکھائی دی کہ پہلے کبھی نہ دی ہو گی۔ وُہ رنگین نقوش بہت دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ آبشاروں کا ترنّم پہلے سے کہیں رسیلا تھا۔ بہت سی خوابیدہ ندیاں اور نالے جاگ اُٹھے تھے۔ خوشبودار خنک ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کشور کے بالوں سے کھیل رہے تھے۔

دیکھتے دیکھتے چوٹیاں سُنہری ہو گئیں جیسے پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہو۔ چند سنہری کرنیں کشور کے چہرے کو چھُو گئیں اور اس کا چہرہ جگمگانے لگا۔

زندگی کتنی عجیب ہے۔ سکون کے بعد طوفان اور طوفان کے بعد پھر سکون۔

رات یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اب نئے سرے سے ہر چیز میں زندگی عود کر رہی تھی۔ میں یُونہی بیٹھا بے پروائی سے اپنی اُنگلیوں سے کھیل

رہا تھا۔ کشور میری اُنگلیوں کو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ”کتنی عجیب ہیں یہ اُنگلیاں۔ وائلن کے تاروں پر کیسی چلتی ہیں؟ سخت نشتر بھی پکڑ لیتی ہیں اور بُرش سے کھیلتے کھیلتے ایسی ایسی تصویریں بھی بناتی ہیں؟“

میں جیسے چونک پڑا۔

”تو کیا سچ مُچ تمہیں یہ اُنگلیاں اچھی لگتی ہیں؟“

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اُس کا سر میرے شانے سے آلگا۔ دفعتہً مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کائنات کِھلکھِلا کر ہنس پڑی ہو اور بے شمار تارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔

وہی ہلکا ہلکا نور تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے تھے۔ پھر نور بڑھتا گیا۔ جھونکے تیز ہوتے گئے۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ زندگی کی دھڑکن بھی تیز ہوتی گئی۔

اور اُس کے بعد ایک لطیف سی مدہوشی طاری ہوگئی جس میں اگر کچھ مخل ہوتا تھا تو وُہ فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ تھی۔

زندگی کتنی عجیب ہے۔ طوفان کے بعد سکون اور سکون کے بعد پھر طوفان!

تب مجھے پتہ چلا کہ دُنیا اتنی پھیکی اور بے کیف نہیں جتنی میں سمجھتا تھا۔ مجھے زندگی کبھی اتنی رنگین نہیں دکھائی دی۔ مجھے فضا میں رنگ برنگے لہریئے نظر آتے۔ سُوکھی ہُوئی ٹہنیوں میں ان کی نئی نئی کونپلیں دکھائی دیتیں۔ ہم دونوں کے گرد تتلیاں ناچتیں۔ چیڑ کے نوکیلے پتّے سرسراتے۔ معطّر پھُول جھومتے۔ فضا نغموں سے گونج اُٹھتی۔ اَن سُنے راگ رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتے اور زندگی رقص کرنے لگتی۔

مجھے یُوں لگتا جیسے ایک پھُولوں کے تختے کے کنارے بیٹھا ہوں۔ پھُول ہوا سے لہلہاتے ہوئے جھُک جھُک کر میرے قدم چُوم رہے ہیں اور میں ہوں کہ بے پروا بیٹھا ہوں۔ پھر رات کو عجیب عجیب خواب نظر آتے۔ جیسے ایک تڑپتے ہوئے پارے کا سمندر ہے، جس میں ایک کشتی ہے، جسے میں چلا رہا ہوں۔ آسمان پر نہ چاند ہے نہ سُورج، نہ تارے، کچھ بھی نہیں۔ بس ایک خلا ہے۔ چاروں طرف دُھندلا سا خلا۔ کشتی میں میرے ساتھ کوئی بیٹھا ہے جس کی شکل کشور سے ملتی ہے۔ نہ کوئی منزل ہے نہ کہیں پہنچنے کی آرزو ہے۔ نہ ہی کہیں کنارا دکھائی دے رہا ہے۔ بس یُونہی چلا جا رہا ہُوں۔

اس کے بعد کشور مجھ سے نزدیک ہوتی گئی اور مجید سے دُور۔ اُن دونوں کی زندگی کے خطوط ایک دوسرے سے دُور دُور ہوتے چلے گئے۔ میں اب بھی تصویریں بنایا کرتا۔ لیکن اب تصویریں نظاروں کی نہیں ہوتی تھیں۔ کشور کی تصویریں بناتے بناتے میرا کمرہ بھر گیا تھا لیکن جی نہیں بھرا تھا۔

مجید کو شاید پتہ تھا یا نہیں مگر وُہ اسی طرح مجھ سے پگلوں کی سی باتیں کرتا۔ ویسی ہی محبّت، ویسا ہی خلوص دکھاتا۔ کشور کو ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھ کر کبھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں آئی۔ کبھی کبھار کشور اُس کے ساتھ بھی چلی جاتی۔ وُہ شاید اس قلیل حصّے پر ہی قانع تھا یا مجھے اتنا عزیز سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں کبھی کوئی اندیشہ ہی نہیں گزرا۔ مگر میرا رویّہ بدستور ویسا ہی تھا۔ میں اب بھی اُسے چھیڑتا، انتہائی بے رُخی سے پیش آتا اور کبھی کبھی تنگ دل بھی کہہ دیتا۔ وُہ سب کچھ ہنستے ہوئے سُن لیتا۔ مگر بعض اوقات تنہائی میں نہ جانے آسمان کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے کیا دیکھتا۔ جیسے کوئی کھوئی ہُوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔

ایک چمکیلی سہ پہر کو ہم باہر پک نِک پر گئے۔ میں نے بڑے شوخ رنگ کی پتلون پہنی اور ویسی ہی جرسی۔

وہاں ایک بہت خوشنما آبشار تھی۔ طے ہوا کہ آبشار کو بیک گراؤنڈ میں لے کر تصویریں کھینچی جائیں۔ میرے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے کشور کو اچھے سے پوز میں ایک پتھر پر بٹھایا اور فوکس کرنے لگا کہ مجید بھی سرکتا سرکتا آیا اور اُس کے ساتھ کھڑا ہوا گیا۔ ویسے اُس کا کشور کے ساتھ کھڑا ہونا بالکل معمولی سی بات تھی۔ آخر اُس کا منگیتر تھا۔ لیکن مجھے بہت بُرا لگا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔

"ارے بھئی مجید! علیٰحدہ کھنچوالینا اپنی تصویر!"

مگر وُہ مُسکراتا ہوا وہیں کھڑا رہا۔

"بھئی ایک طرف ہو جاؤ۔ بہت بُرے لگ رہے ہو۔ لاحول ولا قوۃ۔"

"آخر ہرج ہی کیا ہے؟" وُہ بڑی ملائمت سے بولا۔

"یقین مانو تم اچھّے نہیں لگ رہے ہو اور پھر کشور کے ساتھ تو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔" میں نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا۔

اُس کا مُسکراتا ہوا چہرہ ایک دم مُرجھا گیا۔

"ابھی سب کا گروپ کھینچتے ہیں۔ اُس میں تمہاری تصویر بھی آجائے گی۔"

وُہ چُپکا سا ایک طرف ہو گیا۔ میں نے کشور کی بہت سی تصویریں اتاریں۔

پھر سب کا گروپ فوٹو ہونے لگا۔ مجید پر کشور کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ نہ جانے میں اس قدر خود غرض کیوں بنا ہُوا تھا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ مجید اس کے ساتھ کھڑا ہو۔

"بھئی مجید ایک خوبصورت سا پھُول تو لگا لو اپنے کوٹ کے کاج میں!" میں نے کہا۔

"کیسا ہو؟"

"بس ہلکا ہلکا ہو۔ بہت شوخ نہ ہو؟"

وُہ جھاڑیوں میں غائب ہوا۔ اُدھر میں نے جلدی سے دو تصویریں لے لیں۔ ذرا سی دیر میں وُہ ہانپتا ہوا آیا۔ اس کے کالر میں ایک اُودا سا پھُول لگا ہوا تھا۔

"یہ تصور تو کھینچ گئی۔ اگلی تصور میں سہی۔" میں نے مجید سے کہا۔ وُہ کچھ نہ بولا۔ نہ ہی اُس کے چہرے پر کوئی تبدیلی آئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ وُہ ہم سب سے پیچھے وہ گیا۔ اگلی تصویر میں سب تھے۔ لیکن مجید نہیں تھا۔ نہ جانے وُہ کہاں غائب ہو گیا۔ کسی کو خیال بھی نہ رہا۔

میں اپنا ہیٹ آبشار کے پاس بھول آیا تھا۔ واپس لینے چلا۔ راستے میں دیکھا کہ کوئی زمین پر جھکا بیٹھا تھا۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ یہ مجید تھا اور ایک چھوٹے سے پانی کے گڑھے پر جھکا ہوا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ وُہ بدستور اسی طرح جھکا ہوا تھا۔ شاید اپنا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں اُس کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اب پانی میں دو عکس نظر آ رہے تھے۔

اُس نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ وُہ کچھ دیر دونوں سایوں کو دیکھتا رہا۔ پھر یکلخت تلملا اُٹھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور چہرہ گود میں چھپا لیا۔

پھر ایک ہاتھ کی اُنگلیاں پھیر کر میری طرف جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میں اب تک نہیں جانتا تھا کہ میں زمین پر محض بوجھ ہوں۔ یقین مانئیے مجھے اب تک علم نہیں تھا۔ کہ میں اس قدر بدصورت ہُوں۔ اُف خدایا کس قدر مکروہ ہے یہ شکل!“ اُس نے پھر اپنا سر جھکا لیا۔

”تو پھر کیا ہو!“ میں نے طنزاً کہا ”آسمان پر اُڑنے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔۔۔۔۔۔۔ ایسی شکل کے ساتھ اگر دل اتنا تنگ اور خود غرض نہ ہو۔ تب بھی کچھ نہیں گیا۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ تم کتنے تنگ دل ہو؟۔۔۔۔ تمہارے دل میں اتنی بھی وسعت نہیں۔“

"وسعت!" اُس نے نے دھیمی آواز میں دھرایا "وسعت!" اور اسی طرح سر جھکائے اپنے مُنہ کو ڈھانپے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک نہ تو مجھے مجید نظر آیا اور نہ کشور۔ بار بار بُلانے پر بھی وُہ ہمارے ہاں نہ آتی۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی۔ کھیل کود، سیریں، تصویریں سب پروگرام بند ہو گئے۔ میں اس تنہائی اور جمود سے تنگ آ گیا۔

ایک اُداس شام کو میں جھرنے کے کنارے پتھروں میں بیٹا تھا۔ یونہی خبطی سا پاگل۔ کچھ سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ میری نگاہیں وادی کے خلا میں تیر رہی تھیں۔ میں خالی خالی نظروں سے یہ رنگین نقوش دیکھ رہا تھا۔ ہریالے کنج۔ اُودے اُودے پہاڑوں کے لہریئے۔ خودرَو پھولوں کے تختے اور چمکیلی ندیاں جو عجیب سی لکیریں کھینچ رہی تھیں۔ پتلی پتلی جھلملاتی ہُوئی لکیریں جو کبھی ایک دوسرے کے پاس سے گزر جاتیں اور کبھی ایک دوسرے سے مل جاتیں۔

کِس قدر وسیع ہے یہ وادی؟ قدرت کی چیزوں میں کس قدر وُسعت ہوتی ہے؟ لیکن ان ہی کی قدرت کی عطا کی ہُوئی چیزوں کو ہم بعض اوقات کس قدر تنگ اور محدود بنا ڈالتے ہیں۔

خودبخود میری نگاہیں پہاڑ کی چوٹی پر چلی گئیں۔ جہاں صنوبر کا درخت اکیلا کھڑا تھا۔ سُورج ڈوبنے والا تھا۔ زرد زرد نارنجی شعاعوں سے آسمان کا وُہ گوشہ جگمگا رہا تھا۔

یکایک میں نے دو سائے متحرک دیکھے۔ ایک چھریرا اور حسین سایہ جس کے قدم قدم میں موسیقی تھی۔ رقص تھا اور اُس کے ساتھ ایک بھدّا سایہ جس کی لنگڑاہٹ اور نمایاں ہوگئی تھی۔ اُس وقت وُہ دونوں ایک دوسرے کو کس قدر نمایاں کر رہے تھے؟ آہستہ آہستہ دونوں سائے چوٹی کے اِس طرف اُتر آئے اور صنوبر کا درخت اکیلا رہ گیا۔

نارنجی شعائیں آہستہ آہستہ گلابی ہوتی جارہی تھیں۔ میں ٹکٹکی باندھے چند ننھی ننھی بدلیوں کو دیکھ رہا تھا جو بار بار اپنا رنگ بدل رہی تھیں۔

مجھے ایک آہٹ نے چونکا دیا۔ یہ کشور تھی۔ کچھ گھبرائی ہُوئی سی تھی۔

"کیا ہوا کشور؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے ساتھ بیٹھ گئی اور اپنا سر میرے شانے سے چسپاں کر دیا۔ جیسے میری حفاظت میں آگئی ہو۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وُہ آج جا رہے ہیں؟'' اُس نے چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

''کون؟ مجید! کہاں جا رہا ہے؟''

اُس نے مجھے ٹھہر ٹھہر کر بتایا کہ کئی دنوں سے ان کے ہاں بڑی بد مزگی رہی۔ اس لئے وُہ ہمارے ہاں آئی نہیں۔ مجید طرح طرح کے بہانے تراشتا تھا کہ وُہ کسی اور لڑکی سے شادی کرے گا جو اُس سے محبّت کرتی ہے۔ وُہ منگنی توڑنا چاہتا تھا۔ کشور کے ابّا بہت ناراض ہوئے اور اسے سخت الفاظ کہے۔ کیونکہ مجید کا مستقبل کشور کے ابّا کے ہاتھ میں تھا اور ویسے منگنی بھی بہت پرانی تھی لیکن وُہ نہ مانا اور اپنی ہٹ پر اڑا رہا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ منگنی ٹوٹ گئی اور کشور کے ابّا نے اس سے کہہ دیا کہ چلے جاؤ اور پھر کبھی شکل نہ دکھانا۔ مجید آج شام کو واپس جا رہا تھا۔

اور وُہ دوسری لڑکی کی محبّت اور شادی مجھے اچھی طرح پتہ تھا کہ اُس میں کِس قدر صداقت تھی۔

پھر کشور بولی۔ ”اور انہوں نے دبی زبان سے یہ بھی کہا کہ شاید ایک تنگ دل کے ساتھ کشور خوش نہ رہ سکے۔ ایسے بدنصیب کے ساتھ جس کے دل میں اتنی وسعت بھی نہیں؟“

”مگر وُہ تمہارے ساتھ کیوں آیا تھا؟“

”کہنے لگے چلو میں اپنا آخری فرض ادا کر آؤں۔“

”فرض۔۔۔؟“

”وُہ مجھے آپ تک چھوڑنے آئے تھے لیکن راستے ہی میں لوٹ گئے۔“

دفعتاً میری نگاہ پہاڑ کی چوٹی پر جا پڑی جہاں صنوبر کے درخت کے ساتھ ایک سایہ ہل رہا تھا۔ شفق کی گلابی جھلک میں اُس کی سیاہی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ نہ جانے وُہ اس قدر ڈراؤنا کیوں لگ رہا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی بچھڑی ہُوئی بے چین رُوح سکون کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہو اور اُسے کہیں بھی ٹھکانا نہ ملتا ہو۔

شفق کی سُرخی یکلخت مدھم پڑ گئی۔ سایہ آہستہ آہستہ غائب ہو گیا اور صنوبر کا درخت اکیلا رہ گیا۔

# ثروت

ان لمبے لمبے ستونوں والے دالان میں شیشے کی طرح چمکتے ہوئے فرش پر میں پاگلوں کی طرح پھر رہا تھا۔ اندر ہال کمرے میں میلہ لگا ہُوا تھا۔ پارٹی میں سب لوگ سج کر آئے تھے۔ نکھرے ہوئے چہرے رنگ برنگے لباس، طرح طرح کی خوشبوئیں اور مجھے کھیلتے ہوئے پکڑ لیا گیا اور زبردستی وہاں لایا گیا۔ کالج کا بلیزر، سفید پتلون اور ایک مفلر، بس یہ تھا میرا لباس۔ اِدھر اُدھر چھُپتا پھر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ قلانچ مار کر بھاگ جاؤں۔ ایک دو مرتبہ کوشش بھی کی لیکن فوراً پکڑا گیا اور پھر اُسی لمبے چوڑے جگمگاتے ہال میں لا کر چھوڑ دیا گیا۔ جہاں وُہ دھماچوکڑی مچی ہُوئی تھی کہ الامان۔

میں دالان میں آ گیا۔ منتظر تھا کہ کب یہ ہنگامہ ختم ہوتا ہے۔

صحن سے باغ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں کچھ سکون تھا۔ سرو کے درختوں سے پورا چاند جھانک رہا تھا۔ میں اُن گول گول محرابوں کے نیچے یُونہی پھر رہا تھا۔ خبطی سا آوارہ سا، دل میں وحشت تھی، اُداسی سی تھی۔

اندر آرکسٹرا نہایت ہی پیاری سُروں میں بج رہا تھا۔ ہلکی ہلکی لہریں باہر آرہی تھیں۔ دھیمے دھیمے ہلکورے! یہ مدھم سی موسیقی نہایت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

پھر یکلخت ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مجھے اندر بُلا لیا گیا اور کرسیوں کا کھیل میوزیکل چیرز۔۔۔ شروع ہوا۔ مجھے بھی شریک ہونا پڑا۔ بہت سی کرسیوں کا ایک وسیع دائرہ بنا لیا گیا اور جتنے لوگ وہاں تھے سب کے سب ایک بڑے دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ خواتین بزرگ حضرات، لڑکے لڑکیاں سب! موسیقی شروع ہُوئی اور سب نے چلنا شروع کر دیا۔ دفعتہً آرکسٹرا چُپ ہو گیا اور سب کے سب بے تحاشا کُرسیوں پر بیٹھنے کے لیے لپکے۔ جو رہ گیا اُسے اور ایک کرسی کو نکال دیا گیا۔ پھر موسیقی شروع ہو گئی۔ اسی طرح تعداد کم ہوتی گئی۔ بیس، پندرہ، دس آخیر میں ہم دو رہ گئے۔ میں اور کوئی لڑکی جسے دیکھنے کی مجھے فرصت ہی نہ مل

سکی۔ موسیقی ختم ہُوئی اور ہم دونوں کُرسی کی طرف لپکے اور دھم سے دونوں بیٹھ گئے۔ سب بولے "برابر۔"

فیصلہ ہُوا کہ ایک اور موقعہ دیا جائے اور پھر کھیل شروع ہوا۔ بے شمار نگاہیں ہم دونوں پر جمی ہُوئی تھیں۔ ہم بڑے احتیاط سے قدم اُٹھا رہے تھے۔ موسیقی ختم ہُوئی۔ اس مرتبہ دونوں بے تحاشا لپکے۔ لیکن پھر اکٹھے کرسی پر جا بیٹھے۔ نعرہ لگا۔ "برابر۔"

لوگوں نے کہا۔ "اچھا بھئی ایک موقعہ اور۔" اس مرتبہ جو جھپٹے تو آپس میں بُری طرح ٹکرائے کہ مزا ہی آگیا۔ لیکن پھر دونوں کے دونوں کرسی پر تھے۔

اور انعام کیا تھا؟ ایک سُرخ رنگ کی موٹی تازی بلّی۔ اصلی بھی نہیں اون وغیرہ کی بنی ہُوئی۔ میں نے کہا۔ "یہ انعام انہیں ہی دے دو۔ میں بلّی کے بغیر ہی بھلا۔"

بولے۔ "کیوں آخر؟"

کہا کہ "اوّل تو مجھے بلّیاں پسند نہیں اور دوسرے کبھی سُرخ رنگ کی بلّی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

سب بولے۔ ’’نہیں نہیں۔ کھیل پوری طرح ختم ہونا چاہئے۔‘‘

ایک خاتون نے فیصلہ کیا کہ جو باغ میں سے شبّو کی کلیوں کا گُچھّا توڑ لائے وُہ جیتا۔

خیر! ذرا سی دیر میں ہم دونوں پھُولوں کے تختوں میں پھر رہے تھے۔ دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ اُس نے ایک پودے پر ہاتھ مارا، اور میں نے چھلانگ مار کر وُہ گُچھّا توڑ لیا۔ نہ جانے کِس قسم کے پھُول تھے۔ سونگھتا ہوں تو خوشبو غائب۔ ایک مرتبہ پھر وہی ہوا۔ وُہ بولی ’’نہیں بھئی یُوں نہیں۔ اپنا گچھا علیحدہ توڑو۔‘‘

اس مرتبہ جو پھُول توڑتا ہوں تو سوئی جیسا کانٹا اس بُری طرح ہتھیلی میں چُبھا کہ ہاتھ خُون میں رنگ گیا۔ نہ جانے اُس نے خون کِس طرح دیکھ لیا۔ بولی۔ ’’چلئے فوّارے پر اسے ابھی نکال لیتے ہیں۔‘‘

مجھے شرم آرہی تھی۔ کوٹ پر دو تین کلر لگے ہوئے ہیں اور ایک ذرا سے کانٹے کے لیے ایک لڑکی کا مشکور ہونا پڑے گا۔ وُہ مجھے فوّارے پر لے گئی۔ کانٹا نکالا گیا۔ اس نے اپنے رومال کی پٹّی باندھ دی۔ میں نے اب تک اُسے نہیں دیکھا تھا۔ فقط ایک مرتبہ سرسری نظر ہی ڈالی۔ ایک سنگِ مرمر کا مجسّمہ چاندنی رات میں چمک رہا تھا۔ میں اس قدر مرعوب ہو گیا کہ دوبارہ اُسے نہ دیکھ سکا۔

واپسی پر ہم اتنی سی دیر میں ایسے گھُل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے بہت پرانے رفیق ہوں۔

اندر پہنچے، دراصل شبّو کی کلیاں وُہ لائی تھی۔ میں نہ جانے کیا توڑ لایا تھا۔ بلّی اُسے ملی اور خوب تالیاں بجیں۔

پھر تاش کے کھیل شروع ہوئے۔ وہاں بے شمار میزیں تھیں۔ ہر ایک کے گرد چار چار لوگ بیٹھ گئے اور ہر بازی کے بعد جگہ بدلنی ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ ہم دونوں پارٹنر بنے۔

بجلی کے قمقمے چمک رہے تھے۔ دھیمی سروں میں ارغنوں بج رہا تھا اور میرے سامنے ایک شعلہ تڑپ رہا تھا جیسے سُورج نکل آیا ہو۔ لبوں پر فرشتوں کا سا معصوم تبسّم، بات بات ایسی من موہنی کہ دل میں کھُبی جاتی تھی۔ میری نگاہیں اس خوبصورتی کی دیوی سے ہٹائے نہ ہٹتی تھیں۔ کئی بار میری انگلیاں اُن لمبی لمبی سفید اُنگلیوں سے چھُو گئیں۔ کئی مرتبہ میں نے غلط پتّہ ڈال دیا اور قہقہہ پڑا۔

مجھ میں نہ جنبش کی قوّت باقی تھی اور نہ نظریں ہٹانے کی تاب، بس دیوانوں کی طرح بیٹھا اُس حسین پیکر کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے کی جگمگاہٹ کے سامنے سارے فانوس ماند تھے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ انسانی حُسن ہے یا ملکوتی؟ یہ دلفریبی، یہ بلا کی دلآویزی، یہ مسحور کُن خوبصورتی، اس دُنیا سے تعلق رکھتی ہے یا یہ کوئی حُور ہے جو بہشت سے اُتر آئی ہے۔ اور یہ پیاری صورت کتنی جلدی مجھ سے مانوس ہو گئی ہے۔

یہ نگاہوں کا جادو، مُسکراہٹوں کی بے پناہ لطافت، یہ پیاری پیاری معصوم باتیں۔۔۔ آخر یہ نوازشیں مجھ پر کیوں کی جا رہی ہیں۔ پارٹی میں بے شمار لڑکیاں تھیں۔ ایک سے ایک حسین، لیکن میری نگاہیں محض اس چہرے پر جم کر کیوں رہ گئیں؟ اور اس کے جواب میں یہ نگاہیں مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہی ہیں؟

شاید ہم ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔ شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

جب میں نے شب بخیر کہا تو مجھے اس نے شبّو کی کلیوں کا گُچھّا دے دیا کہ میں اپنے بلیزر میں ٹانک لوں۔ میں کھویا کھویا سا واپس جا رہا تھا۔ دل میں جیسے ایک پھانس چُبھ گئی۔

اور دوسرے روز ایک جگمگاتی ہُوئی رنگین صُبح طلوع ہُوئی۔ ایسی صبح کبھی طلوع نہ ہُوئی تھی۔ سُورج کی کرنوں میں آج کچھ اور ہی روپ تھا۔ انوکھی تازگی تھی، شگفتگی تھی۔

جب میں باغ میں گیا تو سب کچھ ہی بدلا ہوا تھا۔ پھُولوں کے تختے اس قدر رنگین ہو رہے تھے کہ میں اُنہیں دیر تک دیکھتا رہا۔ گھاس کے مخملی فرش پر موتیوں کے قطروں کو روندتا رہا۔ رات کے واقعات نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ کچھ یقین آتا بھی تھا اور نہیں بھی۔

نوکر نے کہا۔ ”فون پر آپ کو کوئی بُلا رہا ہے۔“

پوچھا۔ ”کون ہے؟“

بولا۔ ”آواز تو کسی خاتون کی معلوم ہوتی ہے۔“

سوچا شاید وُہ ہو، اور یہ پریوں کی کہانیوں کا سا طلسم ابھی ختم نہ ہوا ہو بلکہ شاید جاری رہے۔

لیکن وُہ کہاں ہو سکتی ہے۔ نہ اُسے میرے نام کا پتہ ہے نہ کچھ اور۔ ریسیور اٹھایا۔ پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

آواز آئی ''میں۔''

کہا ''جی۔''

آواز آئی ''میں ثروت!''

''تو کیا آپ رات کی پارٹی میں۔۔۔؟''

''جی ہاں!''

مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ وہی ہے۔ تو گویا ثروت ہے اس کا نام۔

''آپ ہی کئی مرتبہ میری پارٹنر بنی تھیں نا؟''

''جی ہاں!''

''اور آپ نے وُہ بلّی جیتی تھی سُرخ رنگ کی۔''

"جی ہاں!"

میں مسرّت سے مغلوب ہو گیا۔ جی میں آیا کہ پوچھوں کہ آپ ثروت جہاں ہیں یا ثروت خاتون یا صرف ثروت!

بولی۔ "آپ ہمارے ہاں اپنے دستانے بھی چھوڑ گئے اور مفلر بھی!"

"تو کیا وُہ۔۔۔؟"

"نوکر کے ہاتھ دونوں چیزیں بھیج دی گئی ہیں!"

اس کے بعد دونوں چُپ! ہم اکٹھے کچھ بول پڑے۔ پھر چپ ہو گئے۔ آخر میں نے کہا۔ "شکریہ" اور ریسیور رکھ دیا۔

ایک پچھتاوا رہ گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وُہ نوکر نہ بھیجتی اور مجھے ان کے گھر جانا پڑتا۔

میں سیدھا امّی کے پاس گیا۔ اُنہیں کچھ کام تھا۔ بولیں۔ "جلدی جلدی کہہ دو جو کچھ کہنا ہے۔"

میں بولا۔ "وُہ یہاں سے جو تقریباً دو میل کے فاصلے پر اس جنگل کے پار ایک محل سا ہے نا! بڑی خوبصورت سی عمارت، جس میں لمبے لمبے سے ستون ہیں اور باغ میں طرح طرح کے پھُول ہیں۔ جہاں رات پارٹی سی ہُوئی تھی!"

"اُفّوہ! یہ کیا سا اور سی لگا رکھی ہے۔ خوبصورت سی، محل سا، ستون سا۔۔۔ ارے بھئی جو کچھ کہنا ہو جلدی سے کہہ چکو۔"

"تو وُہ محل!"

"کون سا محل، کوئی اتہ پتہ بھی بتاؤ گے؟"

میں نے محل کا اتہ پتہ بتایا۔

"تو پھر اب کیا کریں؟" انہوں نے پوچھا۔

"وُہ کبھی آپ کے ہاں آئی ہیں؟"

"غالباً نہیں۔ شاید کبھی آئی ہوں۔"

"اور وہاں آپ کبھی گئیں؟"

"نہیں تو۔"

"تو تھوڑی بہت واقفیت تو ہے ناہماری اُن کی؟"

"کیوں آخر کیا دھرا ہے وہاں؟"

"ویسے ہی میں رات پارٹی میں گیا تھا۔جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر جاؤں۔"

وُہ کچھ سوچ کر بولیں۔ "بیگم کو تو میں جانتی ہوں۔ انہوں نے مجھے دعوت کا رقعہ بھی بھیجا تھا۔ لیکن یہاں سے کوئی جانہ سکا۔"

"امّی کو اگر کوئی دعوتی رقعہ بھیجے تو اُس کا جواب ضرور دینا چاہیے۔""یعنی؟"

"معذرت کی جائے؟"

"اچھا فون کر دیں گے۔"

"اور جو میں ہو آؤں تو؟"

بغیر اُن کا جواب سُنے میں سیدھا بھاگا اپنے کمرے کی طرف، سوچا کہ ابھی تو جانا مناسب نہیں۔ اُس کا فون ابھی ابھی تو آیا تھا۔ کل چلیں گے۔ لیکن کل تک انتظار کون کرے۔ اچھا چلو آج سہ پہر کو چلیں گے۔

سہ پہر کو میں وہاں گیا۔ بہت اچھا کُنبہ تھا۔ نہایت ہی خلیق اور پیارے لوگ تھے۔ بیگم نے باتوں میں لگا لیا۔ امّی کے متعلق پوچھتی رہیں۔ چاء کا وقت ہو گیا۔

میں نے اجازت چاہی لیکن اُنہوں نے مجھے ٹھہرا لیا۔ مجھے باہر پلاٹ میں لے گئیں جہاں سب چاء پی رہے تھے۔ مجھے سب سے ملایا۔ ثروت بھی وہیں تھی لیکن میں اُسے اچھی طرح سے ایک مرتبہ بھی نہ دیکھ سکا۔ وہاں ایک کھیل شروع ہوا۔ سب کو ایک سوال بتایا گیا کہ تمہیں دُنیا میں سب سے پیارا کیا لگتا ہے؟"

اس کا جواب ایک کاغذ پر لکھنا تھا اور جن دو کاغذوں پر ایک ہی جواب ہو اُن کے لکھنے والے جیت جاتے تھے۔ میری باری آئی۔ میں نے سوچا کہ لکھ دوں "ثروت۔" پھر سوچا کہ شبّو کی کلیاں کیوں نہ لکھ دوں۔ ایک ہی بات تو ہے۔ چنانچہ یہی لکھ دیا۔ جب نتیجہ نکالا تو میں اور ثروت جیت گئے۔ دونوں کے جواب ایک ہی تھے۔

بیگم نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ جب میں جگمگ کرتے ہوئے فانوس کے نیچے بیٹھا اُن سے باتیں کر رہا تھا تو ثروت ایک ستون کی آڑ سے قدرے تاریک گوشے میں ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ عجب فسوں تھا اُن نگاہوں میں۔ میں بے چین ہو گیا۔ سفید دوپٹے میں اُس کا چہرہ کیسا تاباں تھا۔ جیسے سیپی میں موتی دمک رہا ہو۔ وُہ تیز نگاہیں گویا مجھے آر پار کئے جاتی تھیں۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اور میں بہک بہک گیا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک اُٹھتے بیٹھتے انہی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ یہی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھرتی رہیں۔ پھر ایک سہ پہر کو گھٹا چھائی ہُوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کمرے میں بیٹھا عمر خیّام کی رباعیات پڑھ رہا تھا۔

یکایک جو کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ پھُولوں کے جھرمٹ میں ثروت امّی سے باتیں کر رہی تھی۔ ارے یہ کہاں؟ بنّو سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ آپا سے ملنے آئی ہے۔ اُدھر آپا اپنی سہیلیوں کے ساتھ سینما گئی ہُوئی تھیں۔

مَیں نے اِدھر اُدھر چکر کاٹنے شروع کئے۔ دو تین مرتبہ امّی سے باتیں کرنے کے بہانے اُن کے پاس بھی گیا۔ پھر پودوں کی اوٹ میں باتیں سُننے لگا۔ امّی اُسے کھانے تک ٹھہرانا چاہتی تھیں اور وُہ جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ امّی بولی "فون پر بیگم کو کہہ دیں گے۔" وُہ بدستور مصر رہی۔ میں نے جلدی سے شوفر کو کار سمیت یونہی فرضی کام بتا کر ایک غلط پتّے پر بھیج دیا اور تاکید کی کہ خبردار جو کام کئے بغیر واپس آیا ہے تو گھر میں اُس وقت صرف میں تھا یا چند بچّے۔ گھٹا گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ثروت کا اصرار بڑھنے لگا۔ آخر امّی نے بنّو کو بلا بھیجا کہ کار باہر

نکلوا لائے۔ لیکن وہاں کار اور شوفر دونوں غائب تھے۔ چنانچہ مجھے بلایا گیا۔ امّی مُسکرا کر بولیں۔ "وُہ شوفر سا کار لے کر کچھ باہر سا گیا ہوا ہے۔ تم جلدی سے انہیں چھوڑ آؤ۔ کہیں بارش سی نہ ہو جائے۔" اور سب ہنس پڑے۔

ہم دونوں چل پڑے۔ میں خوشی کے مارے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ پہلے پہلے تو مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں لیکن صرف موسم کے متعلق، درختوں کے متعلق، بلّیوں کے متعلق۔

ہم ذرا ہی دُور گئے ہوں گے کہ بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "چلو واپس چلیں۔" بولی۔ "نہیں! ابھی لپک کر پہنچ جاتے ہیں۔" تیز تیز چلنے لگے۔ بارش زور سے ہونے لگی۔ آس پاس کوئی کوٹھی نہ تھی۔ ہم جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ ایک دو جگہ گھنے درختوں کے نیچے پناہ بھی لی۔ لیکن بوچھاڑ نے قدم نہ جمنے دیئے۔ بھیگ تو پہلے ہی گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنا اوور کوٹ اوڑھایا۔ وُہ انکار ہی کرتی رہی۔

جب ہم اُس تاریک گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے تو آسمان سے پانی کی دھارا برس رہی تھی۔ ہوا چنگھاڑ رہی تھی۔ دیو قامت درخت تنکوں کی طرح لرز رہے تھے۔ ہوا کے تند و تیز تھپیڑوں سے ہمارے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ ہم پانی میں

شرابور، ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ میرا دل کسی قدر مسرور تھا۔ وُہ لمحے کس قدر خوشگوار تھے۔ جی چاہتا تھا یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو اور یہ طوفان اور بھی تیز ہوتا جائے۔

صُبح صُبح میں ڈرائنگ روم میں ستار کا ریکارڈ بجا رہا تھا کہ ثروت کا فون آ گیا۔ میں نے ریکارڈ بند کر دیا اور باتیں کرنے لگا۔ یہ ستار کون بجا رہا تھا؟ میں نے یونہی کہہ دیا کہ میں بجا رہا تھا۔ بولی۔ "ارے آپ کو ستار بجانا بھی آتا ہے ؟" میں نے کہا۔ "ہاں کچھ یونہی سا" بولی۔ "ذرا پھر بجایئے۔" میں نے گراموفون سرکا کر ٹیلی فون کے پاس رکھا اور ستار کا ریکارڈ لگا دیا۔

اسی طرح ہر روز ہونے لگا۔ مجھے ستار کے جتنے ریکارڈ مل سکتے تھے خریدے۔ ایک روز غلطی سے وائلن کا ریکارڈ بج گیا۔ بولی "تو آپ وائلن بھی بجاتے ہیں؟" مجھے ہاں کرنی پڑی۔ اب وائلن کے ریکارڈ جمع کرنے پڑے۔

ایک دن تو عجیب تماشا ہوا۔ میں فون پر باتیں کر رہا تھا۔ مزے سے کوچ پر لیٹا ہوا تھا۔ ستار کی فرمائش ہُوئی لیکن اٹھنے کو جی نہ چاہا۔ نوکر کو پہلے ہی سمجھا رکھا تھا۔ اسے اشارہ کر دیا۔ اُس نے چابی دی اور ریکارڈ لگا دیا۔ اب جو ریکارڈ بجتا ہے تو زور

زور سے فوجی بینڈ بجنے لگا۔ بے وقوف نے غلط ریکارڈ لگا دیا تھا۔ میں نے لپک کر بند کیا اور معذرت کی۔ ”معاف کیجئے۔ میں نے غلطی سے۔۔۔۔!“

”بینڈ بجانا شروع کر دیا۔“ ثروت بولی۔

”جی نہیں، یہ بینڈ تو سڑک پر جا رہا تھا۔ آپ ستار سُنئے۔“

اب جو ستار کا ریکارڈ لگایا ہے تو راستے میں چابی ختم ہو گئی اور ریکارڈ آہستہ آہستہ ہو کر ٹھہر گیا۔ پھر چابی بھری۔ اتنے میں ثروت بولی۔ ”آپ کون سی سوئیاں استعمال کرتے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ میں چونک پڑا۔

”براہِ کرم سوئی بدل دیجئے اور اچھی سوئیاں استعمال کیا کیجئے۔ ورنہ ریکارڈ خراب ہو جائیں گے۔“

اور فون کا تو ہم نے مذاق ہی بنالیا۔ دن میں کوئی بیس پچیس مرتبہ تو میں نے اُسے بلاتا اور اتنی ہی مرتبہ وُہ مجھے اور باتیں بھی کسی قسم کی ہوتیں؟۔۔۔۔ فون کیا۔ عموماً وُہی بولتی۔ اگر کوئی اور آیا تو کہا۔ ذرا ثروت کو بلا دیجئے۔ ثروت آئی۔ پُوچھا۔ ”اب کیا بجا ہے؟“ بولی۔ ”ڈیڑھ بجا ہے۔“

"اور ہال کمرے کے کلاک میں کیا بجا ہے؟" اس نے دیکھ کر وقت بتا دیا۔ "اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں جو ٹائم پیس ہے، اُس میں کیا وقت ہے؟"

یا یوں کہ "آج تاریخ کون سی ہے؟ یہ مہینہ کون سا ہے؟" بس!

بعض اوقات جب کوئی بات نہ سوچ سکتا تو پھر یہ ہوتا کہ "آج یہاں سخت سردی ہے۔ آپ کے گھر میں بھی سردی ہے کیا؟"

"اس وقت یہاں بڑی تیز آندھی آئی ہُوئی ہے۔ آپ کے ہاں بھی آندھی ہے کیا؟"

ایک دن شام کو میں نے فون کیا۔ بولا "اس وقت غروب آفتاب دیکھئے۔ شفق کی سُرخی سے سارا آسمان جگمگا رہا ہے۔ ویسے یہاں غروبِ آفتاب عموماً رنگین ہوتا ہے!"

"اور طلوع آفتاب بھی نہایت دلفریب ہوتا ہے۔" ایک موٹی اور بھاری آواز آئی اور میں نے جھٹ ریسیور رکھ دیا۔

اس کے بعد فون پر ذرا احتیاط برتنا پڑا۔

میں اُن دنوں جیسے خواب کی دُنیا میں رہا کرتا۔ جہاں تبسّم ہی تبسّم ہوتے، شوخ تتلیاں، رنگ برنگے پھُول، قوسِ قزح کے رنگ اور پرندوں کے چہچہے۔

چُبھی ہُوئی پھانس سے خوب کھیلتا، جی چاہتا تھا کہ یہ خلش کبھی ختم نہ ہو۔ ثروت میری زندگی کا ایک اہم جُزو بنتی جا رہی تھی۔ میں اُن کے ہاں تقریبوں کے علاوہ بھی بُلایا جانے لگا۔ ثروت ہمارے ہاں آپا سے ملنے آجاتی تھی۔

ایک دن میں اُس محل کے باغ میں بیٹھا تھا۔ فوّارے کے پاس اُسی پھُولوں کے تختے میں جہاں ہم نے اس رات پھُول توڑے تھے۔ ثروت مُسکراتی ہُوئی آئی۔ اُس کے ہاتھ میں کئی طرح کے کپڑے تھے۔ بولی۔ "ان پر بیل بُوٹے بنا دیجئے۔" وُہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

درمیان میں ایک چھوٹی سی میز تھی۔ وُہ مجھ سے اتنی نزدیک تھی کہ اُس کا معطّر سانس مجھے چھُو رہا تھا۔ کبھی کبھی میرا ماتھا اُس کی لٹوں سے چھو جاتا اور میرے بکھرے ہوئے بال بھی۔

پہلے پہل تو میں نے اُس کی اُنگلیوں سے اجتناب کیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

وُہ بولی۔ "یہ آڑے ترچھے پھُول کیوں بن رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ ”انگلیاں کچھ کانپ رہی ہیں۔“

بولی۔ ”لائیے پنسل میری اُنگلیوں میں دے دیجئے۔“

اُس کے ہاتھ میں پنسل دے کر میں نے اُس سے بیل بوٹے بنوائے۔ چھوٹی چھوٹی نوکدار پتّیوں والے پھُول، شگفتہ مُسکراتے ہوئے پھُول، ڈنٹھلوں پر جھکے ہُوئی خوابیدہ پھُول، ننھی مُنّی شرماتی ہُوئی کلیاں۔۔۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔ میں نے وُہ گلاب کی کلیوں جیسی پوریں اپنی اُنگلیوں میں تھام رکھی تھیں۔ میں نے شرارتاً کہا۔ ”نہ جانے ان میں میری انگلیاں کون سی ہیں؟“

وُہ بولی۔ ”یہ سب آپ ہی کی ہیں۔“

میں چونک پڑا۔ اُس کی لمبی لمبی سیاہ پلکیں سحر انگیز آنکھوں پر یُوں جھکی ہُوئی تھیں جیسے کسی چشمے پر بید مجنوں کی شاخیں کانپ رہی ہوں۔

زندگی میں چند لمحے ایسے ہوتے ہیں جو کبھی نہیں بھولتے۔ جن کا دل پر اتنا گہرا نقش پڑ جاتا ہے کہ مٹائے نہیں مٹتا۔ اُس کا یہ فقرہ ”یہ سب آپ ہی کی ہیں۔“ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔ مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے ابھی یہ کہا ہو۔

اگلے روز اُن کا کُنبہ کہیں باہر پکنک پر گیا۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ جب واپس آنے لگے تو میں اور ثروت جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے کہ پیدل آئیں گے۔ جب ہم اکٹھے واپس آ رہے تھے تو دُنیا مُسکرا رہی تھی۔

میں نے اپنے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال سنوارے، ڈھلتے ہُوئے سُورج کی سُنہری دُھوپ اتنی تیزی سے چمک رہی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہُوئی جاتی تھی۔ پگھلے ہوئے سونے کی بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے خوشنما جھیلیں دیکھیں۔ شفاف پانی کی سطح پر کنول کے پھُول تیر رہے تھے۔ کناروں پر اُگی ہُوئی جھاڑیوں کے سائے پانی پر تھر تھرا رہے تھے۔

ہم نے شفق سے جگمگاتے ہوئے بادل دیکھے۔ گلابی بدلیاں، اُودے اُودے بادلوں کے ٹکڑے، قوس قزح کے رنگوں کے بادل، اُجلے اُجلے سادے بادل جو غروبِ آفتاب کے ساتھ رنگ بدل رہے تھے۔ پرندوں کے غول کے غول ہوا میں زقندیں بھرتے اُڑتے جا رہے تھے۔ ہم لدے پھندے کُنجوں میں سے گزرے، چھوٹے چھوٹے راستوں سے جنہیں پھُول دار بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہم نے درختوں کے جھُنڈوں میں پرندوں کے رسیلے نغمے سُنے۔ کئی تتلیوں نے دُور تک ہمارا ساتھ دیا۔ ہمیں کئی بل کھاتی ہُوئی چمکیلی ندیاں ملیں۔

درختوں کی اوٹ میں ہم نے چاند کو دیکھا جو پتّوں میں سے جھانک رہا تھا۔ کائنات مسرور تھی۔ زندگی رقص کر رہی تھی۔ ہم باغ میں سبزے پر بیٹھ گئے۔

میں سگریٹ پینے لگا۔ وُہ دیر تک میرے پریشان بالوں کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”اتنے اچھے بال یوں بکھرے ہوئے کیسے بُرے لگتے ہیں۔“

میں سوچنے لگا کہ کیا جواب دوں۔

بولی۔ ”میں انہیں سنوار دوں۔“

اس نے اپنی لمبی لمبی اُنگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کی اور بولی۔ ”اب انہیں ہمیشہ سنوار کر رکھا کیجئے۔“

چاندنی ٹہنیوں اور پتّوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ کہیں روشنی کے ٹیکے تھے۔ کہیں کہیں سائے کے دھبّے۔ فضا میں سناٹا تھا۔

شبّو کی مہک پھیلی ہُوئی تھی۔

ایک دوپہر کو ثروت کے ہاں چند لڑکیاں بیٹھی ”پلانچٹ“ پر سوال پوچھ رہی تھیں۔ ثروت بھی وہیں تھی۔ کسی نے اپنے امتحان کا نتیجہ پوچھا۔

گلاس پر ننھی بچّیوں کی اُنگلیاں رکھوائی گئیں۔ گلاس چلا۔ پہلے ایف تک گیا پھر اے تک اس کے بعد آئی اور آخر میں ایل۔ نتیجہ نکلا "فیل۔" بولی "پرچے بالکل خراب کئے ہیں۔ فیل نہ ہوں گی تو اور کیا ہو گا۔" اور سوال ہوتے رہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں بھی کوئی سوال کروں۔ میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ ایک کو شرارت سُوجھی۔ بولی۔ "اچھا آپ کا سوال ہم پوچھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وُہ کون ہے جس کے لئے آپ کے دل میں بے انتہا عزّت ہے اور اتنی محبّت ہے۔ جس کے لئے آپ کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔"

مجھے بالکل نہ بولنے دیا۔ ذرا سی دیر میں گلاس چلا اور ایس پر جا رُکا۔ وہاں سے اے پر ثروت کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ پھر آر پر اور پھر ڈبلیو پر۔ اب تو وُہ بالکل بہر بہوٹی بنی ہوئی تھی۔ اب جو گلاس اے پر پہنچا ہے تو وُہ فوراً گلاس جھپٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ اب جو قہقہے لگے ہیں تو مجھے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

ایک پھیکے سے دُھندلے دن جب بادلوں کے مٹیالے ٹکڑوں نے سُورج کو ڈھانپ رکھا ہو اور چاروں طرف غبار کا گہرا خول ہو۔ اُس روز نہ جانے دل کیوں اُداس ہو جاتا ہے۔ روح کسی بوجھ کے نیچے دبی رہتی ہے۔ ساری دُنیا غمگین معلوم لگتی ہے۔ ہوا کے جھونکے ٹہنیوں سے گزرتے ہوئے دبی دبی آہیں بھرتے ہیں۔

سب کچھ بے رنگ و بو لگتا ہے۔ تب ہم سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ دُنیا محض ایک بھیانک اور اُجاڑ چٹیل میدان تو نہیں۔ جہاں نہ چاند چمکتا ہے نہ تارے ٹمٹماتے ہیں۔ نہ طلوعِ آفتاب کی جھلکیاں ہیں نہ شفق کی رنگینیاں۔ جہاں زندگی صحرا کے تنہا اور جھُلسے ہوئے درخت کی طرح ہے جسے بادِ سمُوم پنپنے نہیں دیتی۔ جہاں بگولے اُٹھتے ہیں۔ ویرانی چیخیں مارتی ہے۔ لیکن کسی محبوب ہستی کا قُرب اور اُس کی مسحور کُن نگاہوں کا طلسم ایسے وقت بھی زندگی میں کتنی خوشیاں لے آتے ہیں۔ ایسے اُداس ماحول میں زندگی کس قدر رنگین ہو جاتی ہے؟ ایک عجیب سی مُسرّت سے روح پر جِلا چڑھا دیتی ہے۔ تب وہی پھیکے پھلکے بادلوں کے ٹکڑے پراسرار قصر معلوم ہوتے ہیں جہاں کوئی اشارے کرتا ہے۔ اُسی دُھندلی فضا میں رنگ برنگے لہریئے ناچنے لگتے ہیں۔ بگولوں کے سناٹے میں موسیقی سُنائی دیتی ہے۔

ایسی ہی تبدیلیاں ثروت میری زندگی میں لے آئی۔۔۔!

ثروت کے آنے سے پہلے دُنیا کتنی پھیکی تھی۔ بالکل بے معنی سی، اُداس سی، نہ زندگی کا کوئی اصول تھا نہ کوئی مقصد۔ روز سُورج نکلتا تھا، ڈوبتا تھا۔ سب دن ایک سے تھے۔ تنہائی تھی کہ رُوح میں اُتری جاتی تھی۔ فضا کتنی بے کیف تھی۔

خوابوں میں وحشت تھی۔ کامیابیاں بالکل حقیر تھیں۔ مسرّت آمیز خبریں دل پر خوشی کی ذراسی لہر نہ چڑھا سکتیں۔ نہ خوبصورت نظاروں میں کوئی جاذبیت تھی نہ کسی کی رفاقت میں۔

اور جب اُس رات میں نے اتفاق سے ثروت کو دیکھ لیا تو جیسے کسی کھوئے ہوئے کو پالیا۔ جس کی تلاش میں میں مدّت سے سرگرداں تھا۔ میں اُسے بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ اُس وقت سے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے حسین ترین لمحوں میں وُہ مجھے یاد آئی تھی۔

ایک روز میں بہت غمگین تھا۔ کسی امتحان میں پاس ہوتا ہوتا فیل ہو گیا۔ محض معمولی سی بدقسمتی سے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ جہاں تک قابلیت کا سوال تھا۔ میں اس میں پورا اُترتا تھا اور سب یہی سمجھیں گے کہ میں نالائق ہوں۔ شام کو اُن کے ہاں گیا۔ بڑا اُداس، تھکا ہوا۔ بیگم ملیں۔ پُوچھا۔ ”چپ چاپ کیوں ہو؟“ بتایا کہ ”فیل ہم گیا ہوں۔“

متعجّب ہو کر بولیں ”ارے! کیا سچ مچ؟ یا مذاق کر رہے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”سچ مچ!“

بولیں ”چلو اب تک پاس ہوتے رہنے کا ٹیکس لگ گیا۔ تین چار مہینے کی بات ہے۔ پاس ہو جاؤ گے۔“

میں مطمئن نہ ہُوا۔ یہ تسلّی تو تھی۔ لیکن کتنی کھوکھلی سی!

گھر میں اُسے ڈھونڈا پھرا۔ پتہ چلا کہ اپنے کالج میں کسی تقریب پر گئی ہے۔ کچھ دیر بچّوں سے کھیلتا رہا۔ وہاں بھی جی اُچاٹ ہو گیا۔ پھر اُس کے کمرے میں جا بیٹھا۔ تکیے پر نظر پڑی۔ غلاف پر نہایت خوبصورتی سے دو ”S“ کاڑھ رکھے تھے۔ میں سوچنے لگا۔ ان سے کیا بنا؟ ثروت کا تو ایک ہی ایس ہے۔ یہ دوسرا کہیں میرا تو نہیں؟۔۔۔ میرا ہی ہو گا۔ تکیہ اُٹھا لیا۔ اس سے کھیلنے لگا۔ غلاف میں سے ایک تصویر نکلی۔ میری وُہ تصویر جو ایک عرصے سے غائب تھی۔ اُس کے کونے پر چھوٹی سی ایک ثروت کی تصویر چپکی ہوئی تھی۔ میرے سُوکھے ہوئے لبوں پر مُسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ دل کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ وہیں بیٹھا تصویر کو دیکھتا رہا۔ میز پر ثروت کی محبوب خوشبو تھی۔ وُہ کوٹ پر چھڑکی۔ تصویر پر دستخط کئے اور وہیں رکھ دی۔ پھر باغ میں چلا گیا۔ دوپہر میں بارش ہُوئی تھی۔ آسمان نکھرا ہُوا تھا۔ چاند خوب چمک رہا تھا۔ بادلوں کے سفید گالے تاروں کے سمندر میں تیر رہے تھے۔ کبھی کوئی بادل چاند کو ڈھانپ لیتا تو کرنیں جھانکنے لگتیں۔ ہوا کے

خنک جھونکے شبّو کے پودوں کو جھولا جھُلا رہے تھے۔ فوّارے سے نہایت دلکش آواز آرہی تھی۔ دھیمی دھیمی پُرسکون!

چاند کی روشنی نے ان نقوش پر چاندی کا ملمع کیا ہوا تھا۔ میں نے چاقو نکالا اور ایک تنے پر دو "S" کھودے۔ بالکل جیسے ثروت نے تکیے پر کاڑھے ہوئے تھے۔ پھر کوچ پر جا بیٹھا۔ ہوا کے جھونکے تھے۔ شبّو کی مہک تھی۔ چاند کی کرنیں تھیں۔۔۔ مجھے قرار آگیا۔ میری آنکھیں مُندنے لگیں۔ پھر جیسے غنودگی طاری ہوگئی۔ نہ جانے اس طرح کتنی دیر گزر گئی۔ دفعتہً مجھے ایک ملائم ہاتھ کے لمس نے چونکا دیا۔ کسی کی نازک اُنگلیاں میرے پریشان بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ مجھے اتنی تسکین پہنچی کہ میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ تاکہ یہ خواب یا حقیقت جو کچھ بھی ہے، اسی طرح رہے۔ لیکن پھر جیسے کسی نے مجھے بُلایا بھی۔ میرے سامنے ثروت کھڑی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہنے، چاندنی میں بالکل جَل پری نظر آرہی تھی۔ دوپٹے کی گوٹ جگمگ جگمگ کررہی تھی۔ چہرے پر وہی تبسّم تھا جسے دیکھ کر میں سب کچھ بھُول جاتا تھا۔ میں اُسے یوں خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے مجھے اس نظارے کی حقیقت پر شُبہ ہو۔

میں نے اُسے بتایا کہ فیل ہوگیا ہوں۔

"امّی کہہ رہی تھیں کہ آپ کا چہرہ شام کو بے حد زرد تھا۔ آپ بیمار نظر آرہے تھے۔ کیا واقعی آپ کو بہت رنج ہوا؟"

"ہاں کچھ ہوا ہی ہے۔"

"اور میں نے جو دو مرتبہ امتحان نہیں دیا تھا۔" وُہ بولی۔

"وُہ اور بات ہے۔ میں تو آج تک کبھی ناکامیاب نہیں ہوا تھا۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ معمولی سی بات ہے۔ آپ تو کبھی رنجیدہ نہیں ہوا کرتے۔ ضرور آپ کو کوئی خاص صدمہ پہنچا ہے۔"

"نہیں کوئی خاص تو نہیں، بس یہی کہ لوگ کیا کہیں گے۔"

"لوگ تو کل پرسوں تک بھُول جائیں گے۔ شاید آپ کو کسی اور کا خیال ہو جو اُسے دیر تک یاد رکھے گا۔"

"ہاں ہے تو سہی۔"

"وُہ کون ہے بھلا؟"

"وُہ یعنی کہ۔۔۔ وُہ۔۔۔!" میں بتا نہ سکا۔

"اور اگر اُسے معلوم ہوا کہ آپ بڑے قابل لڑکے ہیں۔ نہایت ہی قابل اور اس مرتبہ محض اتفاق ہو گیا۔ تب تو آپ کو افسوس نہ ہو گا۔"

"نہیں! بالکل نہ ہو گا۔" میں یک لخت خوش ہو گیا۔

وُہ کچھ دیر اپنی چوڑیوں سے کھیلتی رہی۔ پھر مُسکرا کر بولی "کم از کم مجھے تو آپ کی لیاقت پر پورا یقین ہے اور اسی لئے آپ کے فیل ہونے پر ذرا سا بھی رنج نہیں۔"

میں اتنا مسرور ہو گیا کہ سچ مچ مُسکرانے لگا۔ میں نے اُسے درخت پر کھُدے ہوئے دو ایس دکھائے۔ جب ہم اس کے لمبے لمبے ستونوں والے دالان میں چمکتے ہوئے فرش پر چل رہے تھے تو میں شگفتہ سروں میں سیٹی بجا رہا تھا۔ مجھے دُنیا بے حد پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ فضا کِس قدر رنگین تھی۔ دُور کہیں بُلبل کا نغمہ سُنائی دے رہا تھا۔ میں روئیں روئیں میں نئ زندگی محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ ایسی ہی چاندنی ہو، ثروت ہو اور بس مُسکراتے ہوئے چلتے رہیں۔

اُسی ہفتے اس کے ابّا کا تبادلہ کسی دوسری جگہ ہو گیا۔ مجھے بھی اُن کے ساتھ جانا پڑا۔ افسوس تو تھا لیکن اتنا نہیں۔ اب میں اُسے خط لکھوں گا، تحفے بھیجوں گا، اپنی تصویریں بھیجا کروں گا اور شاید ثروت بھی بھیجے اور پھر ملتے بھی تو رہا کریں گے۔ کبھی موقع ملا تو فون بھی کریں گے۔

چلتے وقت ثروت بولی ”آپ لاپرواہ بہت ہیں۔ جہاں جاتے ہیں کچھ نہ کچھ بھول آتے ہیں۔ سب کچھ کھو دیتے ہیں۔ وہاں جا کر ذرا خیال رکھیے۔۔۔!“

”کِس بات کا۔۔۔؟“

”یہی کہ زیادہ سیر سپاٹے نہ کیجئے۔ بہت زیادہ کھیلئے مت، پڑھتے بھی رہئے۔ کیا کیا ہدایتیں کی جائیں؟ آپ کے لیے تو باقاعدہ کوئی نگران چاہئے۔۔۔!“

”تم ساتھ چلو۔۔۔ نگران بن کر۔۔۔!“

اس پر وُہ اتنی شرمائی کہ بول نہ سکی۔

ہمیں دوسری جگہ گئے۔ کئی مہینے ہو چکے تھے۔ شروع شروع میں تو ثروت نے کوئی خط نہ بھیجا۔ فقط آپا کے نام اُس کے خطوط آیا کرتے۔ پھر میں نے سہیلی بن کر اُسے خط لکھا۔ جس میں بڑی شکایتیں کیں۔ پھر اس کا ایک خط آیا۔ جس میں نہ القابات تھے۔ نہ اُس کا نام، بس سیدھی سادھی سی عبارت لکھی ہُوئی تھی۔ میں ہر تیسرے روز اُسے خط لکھتا (سہیلی بن کر) جس میں میری ایک نئی تصویر ہوتی۔ اسی طرح باقاعدہ اُس کے خطوط آتے جن میں بعض اوقات تصویریں بھی آتیں۔

پھر یک لخت خطوط بند ہو گئے اور مہینوں تک کوئی خط نہ آیا۔ میں تعطیلات کا منتظر رہا کہ کب ہوں اور اُن کے ہاں جاؤں۔ مجھے میچ کھیلنے ٹیم کے ساتھ باہر جانا پڑا۔ کئی ہفتوں کے بعد واپس آیا۔ دیکھتا ہوں کہ میز پر کئی تار پڑے ہیں۔ گھبرا کر کھولے۔ سب کے سب ثروت کے تھے اور پُرانی تاریخوں میں موصول ہوئے تھے۔ سب میں ایک عبارت تھی۔ "نہایت بُری خبر ہے۔ فوراً آ جایئے۔"

دل کسی آنے والے خطرے سے دھڑکنے لگا۔ خدا جانے کیا بات ہے؟ فون پر کچھ دیر کوشش کی۔ لیکن سلسلہ نہ مل سکا۔ ٹائم ٹیبل دیکھا۔ اگلے دن دوپہر کو کوئی گاڑی اُس طرف جاتی تھی۔ باہر نکلا آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہُوئی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی۔ رات کے دس بجے تھے۔ گیراج کی طرف لپکا۔ معلوم ہوا۔ ابّا دورے پر کار ساتھ لے گئے ہیں۔ موٹر سائیکل نکالا۔ دیکھتے دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ میں نے گھر میں کسی سے کچھ نہ کہا اور موٹر سائیکل لے کر چل دیا۔ اسّی میل کا کچا راستہ تھا، پتھریلا اور ناہموار۔ میں پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سڑک پر بھی پانی تھا۔ اور آسان میں بھی پانی۔ ہوا کے جھکّڑ چل رہے تھے۔ ہر طرف مکمل تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ درخت اُکھڑے ہوئے پڑے تھے۔ ندیاں چڑھی ہُوئی تھیں۔ بجلی رہ رہ کر تڑپتی اور ایک خوفناک کڑاکے کے ساتھ کہیں

گرتی۔ زندگی کی نہایت دشوار راتوں میں سے یہ رات تھی۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ مایوسی تھی کہ دل میں اُتری جاتی تھی۔ رُوح پر بے چینی مسلّط تھی۔ عجب وحشت ناک سی بے چینی! میری نگاہوں میں تار کی عبارت پھر رہی تھی۔ وہ مجھے کسی طوفان کی پروا تھی نہ کسی خطرے کی۔ وُہ جگہ کوئی دس میل ہو گی کہ موٹر سائیکل بگڑ گیا۔ اس بُری طرح کہ ٹھیک کسی طرح نہ ہو سکتا تھا۔ اُسے سڑک کے کنارے پٹخا اور پیدل چل پڑا۔ بھیگتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا، گرتا پڑتا میں وہاں کوئی دو بجے پہنچا۔ بارش یک لخت تھم چکی تھی۔ بادل پھٹ گیا اور آسمان بالکل صاف نکل آیا۔ ایک گوشے سے چاند جھانکنے لگا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو وُہ اتنا بڑا محل سنسان پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔۔۔ بالکل تاریک۔۔۔ بالکل ویران۔۔۔۔ میں دھک سے رہ گیا۔

دل جیسے دھڑکتا دھڑکتا تھم گیا۔ بڑے پھاٹک پر بوڑھے مالی کو بُلایا۔ جو مجھے اندر لے گیا۔ نہ میں نے کوئی سوال کیا نہ اُس نے مجھے کچھ کہا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو اُس کی سفید ڈاڑھی پر آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے۔ فوّارے کے پاس بیٹھ کر اُس نے مجھے رُک رُک کر بتایا کہ کس طرح محل میں ایک ہنگامہ مچا رہا۔ پارٹیاں ہوئیں۔۔۔ ثروت کی شادی پر! سارا محل سجایا گیا۔ بہت دنوں تک یہاں جشن ہوتے رہے۔ دولہا میاں ثروت کے ابّا کے بڑے عزیز دوست تھے۔ وُہ

تھے تو ادھیڑ عمر کے لیکن بڑے معزز عہدے پر فائز تھے اور ثروت کے ابّا انہیں بہت چاہتے تھے۔ یہ اُن کی دوسری شادی تھی۔ ہر جگہ اس شادی کے چرچے ہوتے رہے کہ ثروت کیسے اچھے گھر میں گئی۔ بیگم تو پھولی نہ سماتی تھیں۔ پھر دولھا ثروت کو لے کر بہت دُور چلے گئے۔ ملک کے دوسرے سرے پر۔ ساتھ ہی ثروت کے ابّا کا تبادلہ ہو گیا۔ اور وُہ اس محل کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلے گئے۔ بیچارہ بوڑھا مالی جس نے اتنے سال اُن کے ساتھ گزارے تھے اکیلا وہ گیا۔

ثروت کو آخری دنوں کسی نے بات کرتے نہیں سُنا۔ بس چُپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ ایک اداس دن وُہ کامنی سے مورت چپ چاپ چلی گئی۔ نہ اس کے آنسو نکلے نہ اُس نے کسی سے کچھ کہا۔ شاید یہ غم واندوہ کا سیلاب اُس کے دل میں سما کر رہ گیا اور جب اُس کی رخصت کا وقت قریب آیا تو وُہ کہیں کھوئی گئی۔ تلاش کرنے پر وُہ اُسی کُنج میں ملی جہاں شبّو کے پھُولوں کا تختہ تھا۔ وُہ فوّارے کے پاس بیٹھی تھی جہاں ہم اکثر مِلا کرتے تھے۔ جہاں میں نے درختوں پر اُس کا اور اپنا نام کھود رکھا تھا۔ وُہ وہاں خاموشی سے بیٹھی تھی۔ نہ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی، نہ لبوں پر آہ تھی۔۔۔ اسی طرح دیر تک مالی نے مجھے ایسی ہی باتیں سُنائیں۔

جب میں اُسی محبوب جھُرمٹ میں پہنچا تو چاند غروب ہو رہا تھا۔ میری آرزوؤں اور میرے ارمانوں کا چاند کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کو تکتا رہا۔ تارے ٹمٹماتے رہے۔ کچھ ٹوٹے کچھ غروب ہو گئے۔ میں نے ستارۂ صُبح کو طلوع ہوتے دیکھا۔ پھر مشرق سے ایک نورانی روشنی سارے آسمان پر پھیل گئی۔ ستاروں کی شمعیں مدھم پڑ گئیں۔ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔

ہرے ہرے طوطوں کے جھنڈ پھُر سے میرے سامنے سے گزر گئے۔ شفق پھولا اور سُورج نکل آیا۔ اُجلے اُجلے بگلوں کی قطاریں اُڑتی ہُوئی غائب ہو گئیں۔

میں نے سوچا یہ سب کیا تھا؟ کسی رنگین دُنیا کی پُر سحر زندگی کا بُلاوا تھا؟ یا فردوس گُمشدہ کی جھلک؟ یا خوابوں کے جزیرے سے مجھے کوئی لینے آیا تھا؟

جن حسین آنکھوں نے اتنی دُور سے مجھ پر ایسا سحر کر دیا۔ اگر وُہ سچ مچ میرے قریب آ جائیں تو کیا ہوتا؟ اگر زندگی بھر یہ طلسم نہ ٹوٹتا اور وُہ آنکھیں مجھے دیکھا کرتیں تب؟

یہ پہاڑی سی زندگی یوں گزر جاتی جیسے پھُولوں کے تختے پر ہوا کا تیز جھونکا سُن سے گزر جائے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔

اگرچہ وُہ کہانی ختم ہو چکی تھی، وُہ سحر ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اب بھی میرے تصوّر میں وُہ فوّارہ، باغ کا وُہ دلفریب گوشہ، گول گول محرابوں والا دالان، سب جوں کے توں محفوظ تھے۔

وُہ شبّو کے پھُولوں کا تختہ میری نگاہوں میں پھرا کرتا تھا۔ جہاں مجھے ایک حسین پیکر نظر آتا۔ لمبی لمبی پلکیں حسین آنکھوں پر جھکی ہُوئی ہیں۔ چہرے پر اُداسی ہے۔ گالوں پر موتیوں سے آنسو لرزاں ہیں۔ لمبی لمبی اُنگلیاں مخمل پر چل رہی ہیں۔

کسی اداس سی شام کو تو میں بے چین ہو جاتا۔ وُہ بہت یاد آتی۔ یہ اُداسی دل میں اُتر جاتی۔ اُس کی تصویریں دیکھتا تو جیسے کوئی چُبھی ہُوئی پھانس کو چھیڑ دیتا۔ یہ خلش بڑھتی جاتی۔ دل کو کوئی مسلنے لگتا۔

میں بڑا غمگین رہنے لگا۔ زندگی سے خوشیاں چلی گئیں۔ کسی چیز میں دلچسپی باقی نہ رہی۔ چاندنی راتوں اور زندگی کے اداس لمحوں میں وُہ ضرور یاد آتی۔ خزاں کی کسی اداس سہ پہر کو میں تلملا اُٹھتا۔ کیسا کیسا جی چاہتا کہ اُسے ایک بار دیکھ لوں۔

پھر ایک شام کو میں ایک پارٹی میں مدعو تھا۔ ویسا ہی ماحول تھا۔ جیسا اُس رات تھا جب مجھے ثروت ملی تھی۔ ارغنوں بج رہا تھا۔ کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ میں افسردہ

بیٹھا تھا۔ ایسے جمگھٹے میں بھی بالکل تنہا تھا۔ مجھے ایک سُریلی آواز نے چونکا دیا۔ کوئی لڑکی مجھے تاش میں پارٹنر بنانا چاہتی تھی۔ دو آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ پہلے تو معذرت کی۔ لیکن پھر شامل ہونا پڑا۔ کھیل شروع ہوا۔ میں بڑی بے دلی سے کھیل رہا تھا۔ میری پارٹنر بدستور مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا نام پوچھا اور خود ہی بولی "مجھے صالحہ کہتے ہیں۔" پھر میرے متعلق سب کچھ پُوچھ ڈالا۔ بڑے اشتیاق سے باتیں کرتی رہی۔ نہ اُسے کسی کھیل سے دلچسپی تھی نہ گردونواح کی کسی چیز سے۔ اُس کی ساری توجّہ میری جانب تھی۔ ہمارے گھر کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ چلتے وقت اس نے مجھے اپنی امّی سے ملایا۔

جب میں واپس آ رہا تھا تو سوائے چند لمحوں کے میں نے اُس کے متعلق کچھ نہ سوچا۔ اتنی بُری بھی نہیں تھی۔ شاید خوبصورت تھی۔ لیکن میں نے اُسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔

علی الصبح اس کا فون آیا۔ بولی "یہاں کسی کا ریکٹ رہ گیا ہے۔ آپ کا تو نہیں تھا؟"

میں نے انکار کر دیا۔

اگلے روز پھر فون آیا بولی۔ "آپ کیا کیا کھیلتے ہیں؟ اگر ٹینس کھیلتے ہوں تو مجھے بھی سکھا دیجئے۔" میں نے کہا "میں نہایت وحشیانہ کھیل کھیلتا ہوں۔"

پوچھا"مثلاً"

کہا"مثلاً مُکّابازی۔"

تیسرے روز وُہ آپا کے ساتھ ہمارے ہاں آئی۔ اُن کی ہم جماعت تھی۔ معلوم ہوا کہ باقاعدہ سہیلی بن گئی ہے۔ دو چار مرتبہ اُس کے ساتھ اُسے چھوڑنے جانا پڑا۔ جب آپا اُس کے یہاں مدعو ہوتیں تو بھی میں اُنہیں لینے جاتا۔

میری سالگرہ پر اُس نے آپا کو ایک خوبصورت ساڈبہ دیا جس میں بال سنوارنے کے لیے بُرشوں کا جوڑا، کنگھے اور شیشہ تھا۔ کہنے لگی اپنے بھیّا کو دے دیجیے۔ آپا بڑی متعجّب ہوئیں۔ وُہ بولی "اُن کے بال پریشان رہتے ہیں۔ ان سے کہہ دیجیے کہ سنوار کر رکھا کریں۔" آپا نے ڈبہ لینے سے انکار کر دیا۔ وُہ مچل گئی۔ بولی "جب آپ تحفہ دے سکتی ہیں، تو میں کیوں نہیں دے سکتی۔" آپا بولی "سبحان اللہ نرالی منطق ہے۔" لیکن وُہ نہ مانی اور مجبوراً آپا ڈبہ لے آئیں۔ اب تحائف کا تانتا بندھ گیا اور میں واپس کرتا کرتا عاجز آ گیا۔ صالحہ سے جو لڑکی ملتی ہے۔ یہ اُس سے میری تعریفیں کر رہی ہے۔ لڑکیاں آپا سے پوچھیں کہ صالحہ سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ یہ بیچاری ٹال مٹول کر جاتیں اور تعریفیں بھی کیا ہوتیں۔۔۔۔ یہ کالے سوٹ میں بہت اچھے لگتے ہیں، جب چلتے ہیں تو کیا وقار ہوتا ہے؟ کھیلتے کتنا

اچھا ہیں؟ اور کھیل چکنے کے بعد جب بلیزر پہنے بال بکھیرے واپس آتے ہیں تو بہت ہی پیارے لگتے ہیں۔ باتیں کِس قدر بھولی بھالی کرتے ہیں۔

ایک روز میں اُسے چھوڑنے جارہا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ ہم پیدل جارہے تھے۔ ورنہ عموماً اُسے کار میں چھوڑ کر آیا کرتا۔ دفعتہً اُس کے پاؤں میں موچ آگئی۔ بالکل ہموار سڑک تھی۔ نہ جانے موچ کِس طرح آگئی؟ لنگڑانے لگی۔ مجبوراً بازو پیش کرنا پڑا۔ اُس نے سہارا لے لیا۔

تھوڑی دُور چل کر تو اچھی طرح سہارا لے لیا۔ بلکہ اپنا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔

پہلے میری بے رُخی کی شکایت کی۔ پھر کہا کہ "کاش کہ ہم ہمیشہ دونوں اسی طرح چلا کرتے۔" میں چپ رہا۔

بولی "آپ اتنے لاپروا کیوں ہیں؟" میں نے کہا "میں ہوں ہی ایسا۔ امّی بھی اسی بات سے نالاں ہیں۔ اور آپا بھی کہتی رہتی ہیں۔۔۔!"

وُہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "کاش کہ میں بھی کوئی کہنے والی ہوتی۔"

پھر کہنے لگی" آپ کا تو کوئی باقاعدہ نگران ہونا چاہیئے جو ہر وقت آپ کا خیال رکھے۔۔۔۔!"

میں نے کہا" ایک تھا تو سہی۔ لیکن وُہ کہیں چلا گیا ہے۔۔!"

" اور جو کوئی اور بننا چاہے تو؟" وُہ بولی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور تیزی سے چلنے لگا۔

دن میں کئی کئی مرتبہ اس کا فون آتا جس کا جواب عموماً خادمہ دیتی، جسے میں نے تاکید کر رکھی تھی۔ کبھی میرے کمرے میں تصویر چھوڑ جاتی کبھی کچھ، آخر ایک روز تنگ آ کر میں نے کہہ دیا۔ "آپ کو میری کیا بات پسند ہے جو آپ اتنی مہربان ہیں؟"

بڑی شرما شرما کر بولی "آپ کو لباس پہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ آداب آتے ہیں۔ کھیلتے اتنا اچھا ہیں۔" اسی قسم کی کئی اُلٹی سیدھی خوبیاں گنوادیں۔

جس سے پتہ چلا کہ اُسے میں اچھا نہیں لگتا تھا بلکہ یہ تصنُّعات پسند تھے۔

آہستہ آہستہ میرے دل میں اُس کی نفرت کم ہوتی گئی۔ اب مجھے نہ تو اس میں کوئی دلچسپی تھی۔ نہ ہی اُس سے دُشمنی تھی۔ محض ایک دوست کی حیثیت سے

میں اُس سے برتاؤ کرنے لگا۔ بعض اوقات تو وُہ پگلی لڑکی ایسی ایسی باتیں کرتی کہ مجھے اُس پر ترس آنے لگتا۔

میں نے اپنا آخری امتحان پاس کر لیا اور مجھے بہت دُور سے بلاوا آ گیا۔ کسی عزیز نے بلایا تھا۔ میرے مستقبل کے سلسلے میں۔ صالحہ مچل گئی۔ بہتیرا کہا کہ کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ آتا جاتا رہوں گا۔ لیکن وُہ نہ مانی۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہا "آخر تم کیوں اس قدر مصر ہو؟"

وُہ رو کر بولی۔ "میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میں کیوں مصر ہُوں" مجھے بڑا ترس آیا۔

بولی۔ "خُدا کے لئے آپ کہیں نہ جایئے۔ اب کم از کم دوسرے تیسرے آپ دکھائی تو دے جاتے ہیں، پھر یہ بھی نہ رہے گا۔"

میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب صالحہ کے ابّا مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے بھی مجھے اتنی دُور جانے سے منع کیا۔

ایک روز اُن کے ہاں سے پیغام آ گیا۔ امّی کو وُہ بری نہیں لگتی تھی۔ آپا کی تو وُہ سہیلی تھی۔ لیکن میں عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ میرے دل میں اُس کے لئے ترس پیدا ہو گیا۔ گھنٹوں یہی سوچتا رہتا۔ لیکن کوئی حل نہ ملتا۔

ان ہی دنوں مجھے ابّا کے ساتھ باہر جانا پڑا۔ واپسی میں مَیں اکیلا تھا۔ راستے میں وُہ جگہ بھی آتی تھی، جہاں کبھی ہم پہلے رہا کرتے تھے۔ جہاں ثروت کا وُہ محل تھا۔ جی میں آیا کہ چلو وُہ اُجاڑ محل ایک مرتبہ دیکھ لیں۔ شاید پھر کبھی اتفاق نہ ہو۔

جب میں وہاں پہنچا تو موسم بہت خوشگوار تھا۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہُوئی تھی۔ ہوا کے خُنک جھونکے پتّوں پر سرسرا رہے تھے۔ محل بالکل سنسان پڑا تھا۔

میں اُس کے لمبے لمبے ستونوں اور گول گول محرابوں والے دالان میں پھرا۔ اُس ہال کمرے میں بیٹھا رہا جہاں میں نے پہلی مرتبہ اس شعلے کی تڑپ دیکھی تھی۔ اب پہلے سے سب کچھ بدلا بدلا لگتا تھا۔ لیکن فوّارے کے پاس وُہ درختوں کا جھُرمٹ بدستور تھا جہاں ہم دونوں باتیں کیا کرتے تھے۔ جہاں ثروت جاتے ہوئے آخری مرتبہ بیٹھی رہی تھی۔ خُدا جانے وُہ یہاں بیٹھ کر کیا سوچتی رہی ہو گی۔ کیا کیا قیامتیں اُس کے دل پر گزر گئی ہوں گی۔ اُس کے دل کی پژمردگی اُسے کیسے کیسے ویرانوں میں لے گئی ہو گی؟

اُن درختوں پر ہمارے نام کھدے ہوئے تھے۔ شبّو کے پھولوں کا تختہ بھی بدستور تھا۔ اُن شبّو کے پھُولوں سے کسی محبوب ہستی کی یاد وابستہ تھی؟

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے باغ کے کسی گوشے سے ثروت مجھے دیکھ رہی ہو۔ وُہ محبّت کی دیوی۔۔۔ وُہ حسین و جمیل رُوح، جو مجھے اس قدر چاہتی تھی۔ جس کا خلوص بے پایاں سمندر کی طرح گہرا تھا۔ گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے۔ جگمگاتے ہوئے لمحے، بیتی ہُوئی گھڑیاں۔۔۔ پھر واپس لوٹ آئیں۔

اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ شاید سُورج غروب ہو چکا تھا۔ مجھے ہلکی ہلکی پھوار نے چونکا دیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔۔۔ اس سرزمین میں مَیں نے بے چینی اور مسرّت کے طویل دن اور سحر زدہ راتیں گزاری تھیں۔ یہاں ایسے خوش نصیب لمحے بھی بیتے تھے جن کی یاد دل کی زندگی ہے۔ میری روح کے حِصّے یہاں بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ یہاں میری تمنّائیں خوابیدہ ہیں۔ آرزوئیں مدفون ہیں۔ اسی جگہ میرے ارمانوں کا چاند طلوع ہوا اور یہیں غروب ہو گیا۔ اگرچہ اب ثروت یہاں نہیں ہے لیکن اس کی یاد نے اس جگہ کو کِس قدر دلفریب بنادیا ہے۔ اُس کا حسن سارے نظارے کا ایک جزو ہے۔

زندگی میں محبّت ایک ہی بار ہوتی ہے۔ ثروت ہی میری زندگی ہے۔ وہی محبّت ہے۔ صالحہ ایک اجنبی ہے۔ میں اُسے بالکل نہیں پہچانتا۔ اب میں یہاں سے بہت دُور چلا جاؤں گا۔

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ وُہ بند جو میں نے اس سیلاب کو روکنے کے لئے بنایا تھا ٹوٹ گیا ہے، وُہ حقیر کوشش بالکل بے کار ثابت ہوئیں۔ ایک سیلاب آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔

میں نے سوچا۔ تم میری ثروت ہو، صرف میری۔ تم میری رُوح کی محبوب ہو، میرے تخیّل کی رانی ہو۔ جب تم مجھ سے نزدیک تھیں تو تمہیں دیکھ کر کائنات مُسکراتی تھی۔ دل رقص کرتا تھا اور زندگی نہایت عزیز شے معلوم ہوتی تھی۔ اور اب تم مجھ سے دُور ہو۔ تو تمہاری یاد ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔ یہی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ تمہارا تصوّر مجھے کہیں کہیں لئے پھرا ہے۔ ہم اونچے اونچے پہاڑوں میں بہتی ہوئی ندیوں میں کشتی کی سیر کی ہے۔ نیلے پانی کی شفاف سطح پر پھولوں سے لدی ہُوئی بیلوں کے نیچے سے گزرے ہیں۔ کشتی بیلوں سے چھُو گئی اور تم پر اُودے اُودے پھُولوں کی بارش ہو گئی۔ چاندنی راتوں میں ہم اُجاڑ صحراؤں میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھرے ہیں۔ ریت کے سنہرے ٹیلوں پر، درختوں کے لرزتے ہوئے سایوں میں ہم نے ایک دوسرے کو اپنے دل کے راز بتائے ہیں۔ رات کی رانی اور تمہارے محبوب شبّو کے پھُولوں میں ہم نے اکثر آنکھ مچولی کھیلی ہے۔ بھیانک ویرانوں میں جہاں تنہائی چیخیں مارتی ہے، ہم گہری دھند میں کھو گئے اور نہ جانے کب تک راستہ ڈھونڈتے رہے۔ طوفان زدہ سمندر

میں کسی چھوٹے سے سفینے میں گھٹاٹوپ تاریک چھت کے نیچے ہم نے صُبح کر دی۔ زندگی کے تلخ لمحوں میں میں نے تمہارا قرب محسوس کیا۔

محبّت کبھی نہیں پلٹتی۔ یہ پیارا سپنا غیر فانی ہے۔ زندگی کی شام ہی میرے لئے صُبحِ زندگی ہے۔ سب کچھ کھو کر ہی میں نے سب کچھ پا لیا ہے۔

تب مجھے یوں محسوس ہُوا کہ وُہ پھانس جس کی خلش اتنے عرصے سے تڑپا رہی تھی۔ جسے نکالنے کے لئے میں نے کیا کیا جتن کئے تھے۔۔۔ وُہ میری روح میں ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔

جب میں اُس اُجڑے ہوئے محل سے واپس آرہا تھا تو چاروں طرف تاریکی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے چنگھاڑ رہے تھے۔ بادلوں سے پانی کی دھارا بہہ رہی تھی۔ چاروں طرف سیلاب ہی سیلاب تھا۔ بڑے بڑے دیو قامت درخت تنکوں کی طرح لرز رہے تھے۔

جب میں بھیگتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا اس بھیانک جنگل سے گزر رہا تھک۔ تو زمین و آسمان میں ایک زبردست طوفان آیا ہوا تھا۔

لیکن میرے دل میں اس سے کہیں تندو تیز طوفان بپا تھا۔